نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب

ہفت روزہ

نصرت

لاہور

۱۶

اتوار: ۱۲ جنوری ۱۹۶۹ء

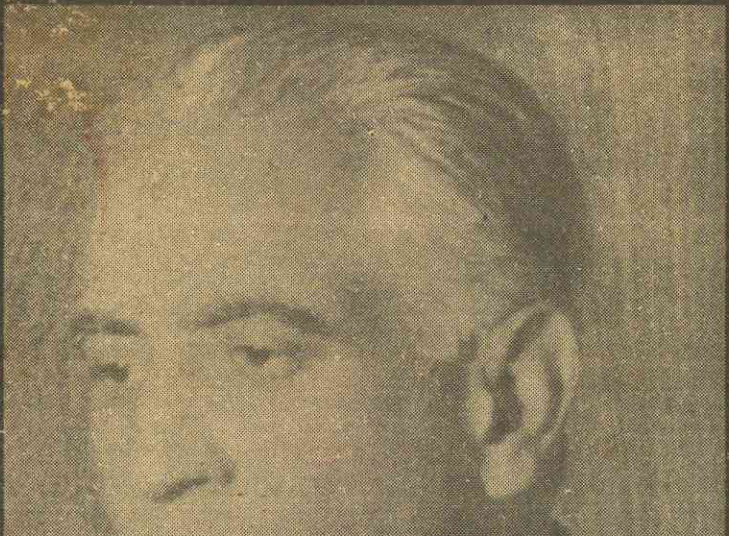

ملک معراج خالد ایم پی اے

مدیر: محمد حنیف رامے

۳۰ پیسے

حسن حمیدی

مشعلِ خوں

آج آباد ہے زنداں تو نئی بات
نہیں
پہلے بھی شورِ سلاسل سے فضا گونجی ہے
پہلے بھی روزنِ زنداں سے کرن پھوٹی ہے
پہلے بھی ہم نے اٹھایا ہے صداقت کا علم
پہلے بھی ہم نے سجایا ہے لہو کا پرچم
پہلے بھی سطوتِ ظلمت کا بھرم ٹوٹا ہے
پہلے بھی قلعۂ اربابِ ستم ٹوٹا ہے
آج گلپاش ہیں سینے تو نئی بات
نہیں
پہلے بھی ظلم نے رستوں پہ بکھیرا ہے لہو
وہ لہو صبحِ مسرت کی ضیا بنتا رہا
دستِ فردا کے لیے رنگِ حنا بنتا رہا
خون بہتا ہے تو ہونٹوں کی کلی کھلتی ہے
خون بہتا ہے تو نعروں کو زباں ملتی ہے
مشعلِ خوں سے بڑا راہنما کوئی
نہیں
دوستو! ہم سفرو! راہبرو! دیدہ ورو
ظلم سنگینوں کی اکڑی ہوئی گردن کی طرح
آج زنداں کی سلاخوں کا سہارا لے کر
نظمِ تعذیر و تشدد کا قبالہ لے کر
آج پھر خون کے طوفان سے ٹکرایا ہے
آج پھر ظلم نے تاریخ کو دہرایا ہے
آج مقتل کی طرف تیشہ بدست ہم بھی چلیں
موجِ خوں صبح کی کرنوں کی علامت بن جائے
کاسۂ سر کے عوض حسن کا سورج ابھرے
دوستو! آج یہ سودا کوئی مہنگا تو نہیں

دوستو! دیدہ ورو! ہم سفرو! راہبرو
ظلم پروردۂ اغیار ہے اور کچھ بھی نہیں
ظلم گرتی ہوئی دیوار ہے اور کچھ بھی نہیں
ظلم ٹوٹی ہوئی تلوار ہے اور کچھ بھی نہیں
مشعلِ خوں سے بڑا راہنما کوئی نہیں

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم بے عملی میں نہیں، عمل میں تعاون کریں گے

یہ عوامی بیداری کا دَور ہے، عوامی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ لوگ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اہم قومی مسائل طے کرتے ہوئے عوام سے رائے لی جائے، انھیں اعتماد میں لیا جائے۔ ہماری اپوزیشن جماعتیں یہ موقف رکھتی ہیں کہ کسی ایک شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے کہ وہ پوری قوم کے لیے ایک دستور بنا کر اس دستور کی حفاظت کے بہانے تمامتر اختیارات کا مالک بن بیٹھے۔ اپوزیشن کہتی ہے کہ طرزِ حکومت اور طرزِ انتخاب جیسے معاملات پر عوام سے رائے لینی چاہیے، ون یونٹ کے معاملے بھی عوامی خواہشات کا احترام کرنا چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو اہم قومی مسائل پر عوامی استصواب کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے اور صدارتی امیدوار کھڑا کرنے کے بارے میں عوام کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کیا یہ مسئلے اہم قومی مسائل کی فہرست میں جگہ پانے کے مستحق نہیں یا انھیں عوامی تائید کے بجائے حسبِ معمول محلاتی سازش کے ذریعے حل کرنا مقصود ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے امیدوار، ذوالفقار علی بھٹو، کو عوام کی صوابدید اور فیصلے کے لیے پیش کر کے ان چند لوگوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے جو عوام کے نام پر بند دروازوں کے پیچھے بیٹھ کر صدارتی امیدوار جیسے اہم قومی مسئلے کا از خود فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔ جس طرح یہ لوگ پارٹی کے اس فیصلے سے تلملائے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے کیا عزائم تھے۔ پارٹی کا یہ فیصلہ ڈپلومیسی کی ایک باکمال ضرب ہے۔ پارٹی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ حالات کے بدلنے کی منتظر نہیں رہتی بلکہ آگے بڑھ کر خود حالات کو بدلنے کی کامیاب کوشش کر سکتی ہے۔ یہ عوامی بیداری ذوالفقار علی بھٹو سے پہلے کسی دوسرے قائد نے کیوں پیدا نہ کر دی تھی اور یہ عوامی جد و جہد پاکستان پیپلز پارٹی سے پہلے کسی دوسری پارٹی نے کیوں شروع نہ کر دی تھی —— اس لیے کہ دوسرے قائد اور پارٹیاں حالات موافق ہونے کی منتظر تھیں، حالات کو بدلنے کے لیے قربانی دینے پر تیار نہ تھیں۔

یہ فطری امر تھا کہ جب حالات بدل گئے تو انتظار گاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی باہر آ گئے۔ اب ان لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ قائدِ عوام بھٹو کی "عدم موجودگی" سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں اور ان کی برسرِ جد و جہد پارٹی کو نظر انداز کر کے صدارتی امیدوار کے بارے میں اُسی طرح کوئی فیصلہ کر لیں جس کی انتہائی غیر عوامی روایت ہمارے یہاں پچھلے بیس برس سے چلی آتی ہے۔ یہ چال یہ لوگ پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف چلنا چاہتے تھے اور جس میں ناکام رہنے کے باعث اب وہ سخت تلملا رہے ہیں، پاکستان پیپلز پارٹی نے اس کا پیشگی اندازہ کرتے ہوئے، بھٹو صاحب کے صدارتی امیدوار ہونے کا اعلان کر کے، راستے ہی میں اُس چال کی ہوا نکال دی اور یوں ایک نئی صورتِ حال کو جنم دے دیا جس میں اب باقی اپوزیشن کے لیے اس کے سوا کوئی رستہ نہیں رہ گیا کہ وہ محلاتی سازش کا طریقہ چھوڑ کر عوامی جد و جہد سے گریز کی راہ ترک کر کے پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بہ شانہ آ کھڑی ہو۔ اپوزیشن پارٹیوں نے عوامی تحریک چلانے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت مبارک ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی تو پہلے ہی اس تحریک میں سرگرم ہے اور اس کا قائد اسی تحریک کی سربراہی کی پاداش میں جیل میں قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہے اور ایک باعمل پارٹی کے طور پر اُس کی طرف سے دوسری اپوزیشن پارٹیوں کی یہ نیت یقیناً سراہی جائے گی کہ وہ بھی عمل کے لیے کمر باندھ رہی ہیں۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

کہا جا رہا ہے کہ صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان سے پیپلز پارٹی نے موجودہ بدعنوان طرزِ انتخاب کو استحکام اور وقار بخش دیا ہے۔ پیپلز پارٹی سے پہلے گزشتہ انتخاب میں یہی کام متحدہ اپوزیشن کر چکی ہے۔ پیپلز پارٹی نے تو انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ اپنے اسی اصول کے تحت کیا ہے کہ حریف کا مقابلہ ہر سیاسی محاذ پر کیا جائے گا۔ اگر کسی منطقی بے ربطی کا مظاہرہ ہو رہا ہے تو باقی اپوزیشن جماعتوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اگر پچھلے انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح نے میدانِ عمل میں آ کر کوئی قومی خدمت کی تھی تو اب اس میدان کو کیوں خالی چھوڑ دیا جائے جبکہ صدر محمد ایوب خاں کی شہرت اور صحت کو گھن لگ چکا ہے اور وہ عوامی بیداری جو انتخابات کے قریب ہوا کرتی ہے سال بھر پہلے ہی پیدا ہو چکی ہے اور اس بیداری کو جد و جہد میں ڈھالنے کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کی جرأتِ مردانہ نے رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس امکان کو کیوں خارج از بحث کر دیا جاتا ہے کہ جس طرح صدر صاحب کی بیماری کے

دنوں میں ایک سیاسی خلا پیدا ہوگیا تھا اُسی طرح کا کوئی خلا اب بھی پیدا ہو سکتا ہے اور اگر متبادل قیادت کا کوئی نقشہ قوم کے سامنے نہ رکھا گیا تو ملک میں اقتدار کی رسہ کشی شروع ہو جائے گی جس کا نتیجہ خانہ جنگی بھی ہو سکتا ہے ۔ اور کیا ایک ایسے وقت میں جب کہ علاقائی منافرت نے جڑ پکڑ رکھی ہے کسی طرح یا سطح کی خانہ جنگی کا پہلا مرحلہ یہ نہ ہوگا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان الگ الگ ہو جائیں بلکہ مغربی پاکستان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ۔

انتخابات کے میدان کو حریف کے لیے بالکل خالی نہ چھوڑنا اپنی جگہ بھی غلط حکمت عملی ہے لیکن متبادل قیادت کا نقشہ پیش نہ کرنا ملکی سالمیت اور خود مختاری کے لیے اور بھی ناگزیر ہے ، کیونکہ خدانخواستہ ملک میں اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی تو بیرونی طاقتوں کو اور بھی کھُل کھیلنے کا موقع مل جائے گا اور وہ پاکستان کو انڈونیشیا بنانے سے گریز نہ کریں گی پھر موجودہ حکومت بھی متبادل قیادت کے فقدان کے حوالے سے قوم کو خانہ جنگی سے ڈرا رہی ہے ۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے عوامی جدوجہد کی قیمت پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ نہیں کیا ، انتخابات کو عوامی جدوجہد میں ایک ضروری قدم سمجھتے ہوئے قبول کیا ہے ۔ اس کا اصل مقصد عوامی جدوجہد ہی ہے اور وہ ابھی تک اس میدان میں سب سے آگے ہے ۔ اگر بقیہ اپوزیشن بھی جدوجہد کی راہ پر چل نکلے تو پیپلز پارٹی عمل کی اس راہ پر اس کے ساتھ بھرپور تعاون کرے گی ۔ ایئر مارشل اصغر خاں نے درست کہا ہے کہ جہاں تک عمل یا جدوجہد کا تعلق ہے اب سب اپوزیشن پارٹیاں متفق ہیں ، ان میں صرف انتخابات لڑنے یا لڑنے پر اختلاف ہے ۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اپوزیشن کے ساتھ عمل میں تو تعاون کرے گی لیکن بے عملی میں نہیں جس میدان میں بقیہ اپوزیشن بے عمل رہنا چاہتی ہے اگر پیپلز پارٹی اس میں بھی حریف کا مقابلہ کرنے پر تلی ہوئی ہے تو اسے اس عمل سے روکنے کی آخر کیا تُک ہے ۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اُوست ۔

محمد حنیف رامے

مسٹر جے اے رحیم لاہور میں پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں

حسینی نقوی

حالاتِ حاضرہ

آئندہ صدارتی انتخابات کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے اعلان نامزدگی نے حکومت کے علاوہ رجعت پرست سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ میں بھی کھلبلی مچا دی ہے اور یہ خلافِ توقع بات بھی نہیں تھی ۔ ان جماعتوں میں قیادت کا فقدان پچھلے انتخابات کے موقع پر کھل گیا ہوتا لیکن مادرِ ملت نے بروقت صدارتی امیدوار کی حیثیت سے موجودہ حکمران ٹولے کی مخالفت کرنے پر آمادگی کا اظہار کر کے اُنھیں اس وقت شرمندگی سے بچا لیا تھا ۔ اس بار یہ جماعتیں مسٹر بھٹو کی عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیشِ نظر خوفزدہ نظر آنے لگی تھیں اور ان کی مایوسی میں اس وقت کچھ اور اضافہ ہو گیا ، جب ایئر مارشل اصغر خاں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ صدارتی امیدوار بننے کے لیے سیاست کے میدان میں نہیں آئے ہیں ۔ پھر بھی ان جماعتوں کے ہاتھ میں ، جن کی قیادت کے فرائض سامراج نواز اور عوام دشمن جماعتِ اسلامی انجام دے رہی ہے ایک مہرہ بچ گیا تھا ، یعنی یہ کہ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کو جھوٹا دلاسہ دلانے کے لیے وہاں سے کسی غیر معروف شخص کو صدر ایوب کے مخالف کی حیثیت سے نامزد کر کے موجودہ حکمران ٹولے سے سودے بازی کی کوئی راہ ہموار کر سکیں ۔ لیکن پیپلز پارٹی کے سربراہ مسٹر جے ۔ اے ۔ رحیم نے اپنی پارٹی کی جانب سے مسٹر بھٹو کی امیدواری کا اعلان کر کے

پی۔ ڈی۔ ایم کی اس غیر جمہوری کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ”تکلیف“ جماعت اسلامی اور نظامِ اسلام پارٹی کو ہوئی اور انھوں نے اس نامزدگی کے خلاف اپنی مہم کو تیز تر کر دیا۔ پی۔ ڈی۔ ایم میں شامل بالخصوص ان دو جماعتوں نے اپنے اس ردِ عمل سے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ”وہ جمہوریت“ کو محض اپنی چودھراہٹ کے لیے دھوکے کی ٹٹی کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہیں۔ پی۔ ڈی۔ ایم میں شامل یہی وہ جماعتیں ہیں جنھوں نے پچھلے انتخاب میں اس بی۔ ڈی سسٹم کے تحت خود بھی حصّہ لیا تھا۔ لہٰذا صرف اس واسطے کہ کوئی دوسری جماعت بھی اس نظام کے تحت انتخاب میں حصّہ لینے کے لیے کسی امیدوار کو نامزد کرے کسی طرح پی۔ ڈی۔ ایم کی جانب سے موردِ الزام نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ آج سے چند روز پہلے تک، بلکہ ڈھاکہ میں اجلاس کے دوران بھی پی۔ ڈی۔ ایم الیکشن میں حصّہ لینے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتی رہی ہے اور سیاسی حلقوں کے علاوہ عوام بھی اس امر سے واقف ہیں کہ مختلف اوقات میں پی ڈی۔ ایم کے صدارتی امیدوار کی حیثیت سے مسٹر محبوب مرشد، مسٹر نور الامین، عطاء الرحمٰن خاں وغیرہم کے نام لیے جاتے رہے ہیں۔ ہاں البتہ یہ حقیقت ضرور ہے کہ یہ تمام حضرات اور پی۔ ڈی۔ ایم میں شامل تمام سیاسی پارٹیاں اور افراد عوام میں وہ مقبولیت اور تائید حاصل نہ کر سکے جو مسٹر بھٹو کو حاصل ہوئی۔

قصور میں بھٹو کی سالگرہ منائی جا رہی ہے

جہاں تک مسٹر بھٹو کی جماعت اسلامی کی نظر میں غیر مقبولیت کا تعلق ہے تو اس کی وجہ صاف اور واضح ہے۔ مسٹر بھٹو کشمیر کے مسئلے پر کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی پُرزور حمایت کرنے کے علاوہ کشمیری عوام کی تحریکِ آزادی کے ہمنوا ہیں۔ یہ وہی تحریکِ آزادی ہے جس کا مذاق جماعت اسلامی شروع ہی سے اڑاتی چلی آئی ہے اور جس نے کشمیری عوام کی تحریکِ آزادی کے ابتدائی شہیدوں کی شہادت کو ”کتے کی موت“ سے تعبیر کیا تھا۔ اس کے علاوہ مسٹر بھٹو پاک چین دوستی کو پروان چڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کر چکے ہیں اور وہ پاکستان کی سلامتی اور کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی جد وجہد میں عوامی چین کی حمایت کو انتہائی اہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جب کہ جماعت اسلامی اپنی امریکہ نواز پالیسی کی بدولت ملک میں وہ واحد سیاسی جماعت ہے جو پاک چین دوستی کی کھلم کھلا مخالفت کرتی ہے۔ پھر بھٹو صاحب نے پیپلز پارٹی کے بنیادی نعروں میں ”سوشلزم ہماری معیشت ہے“ کا برملا اعلان کر کے جماعت اسلامی کے لیے ایک نیا دردِ سر پیدا کر

پنڈی کے طالب علم رہنما شیخ عبد الرشید لاھور میں

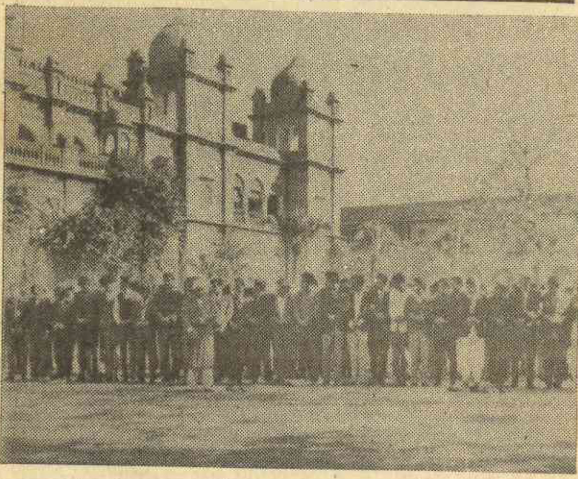
لاھور میں شہید طلباء کی نماز جنازہ

لاھور میں طالب علم راھنما خالد چودھری تقریر کر رہے ھیں

دادو (سندھ) میں سیاسی نظر بندیوں کے خلاف پاکستان پیپلز پارٹی کا احتجاجی جلوس

دیا ہے۔ یہی وہ وجوہات ہیں جن کے سبب سے جماعتِ اسلامی صدارتی امیدوار کی حیثیت سے مسٹر بھٹو کی سب سے سخت مخالف ہے حالانکہ اس جماعت نے پچھلے الیکشن میں مخصوص حالات کی بناء پر اپنی پارٹی کے اندر مخالفت کے باوجود مادرِ ملت کا انتخاب میں حصہ لینا جائز قرار دیا تھا۔

ایک قابلِ مذمت مہم

پیپلز پارٹی اور سوشلزم کی حامی دوسری جماعتوں کے خلاف جماعت اسلامی اور اس کے حواریوں نے ایک نئی مہم چلا دی ہے۔ کراچی میں ایئر مارشل اصغر خاں کی آمد کے وقت جب جماعتِ اسلامی نے سوشلزم اور عوامی جمہوریہ چین اور اس کے عظیم قائد چیئرمین ماؤ کے خلاف نعرے لگائے اور اس کے جواب میں، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف نعرے لگائے گئے تو جماعت اسلامی نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اسلام کے پاک نام کو استعمال کرنے کی مکروہ سازش کی اور یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور طلباء نے "اسلام مُردہ باد" کا نعرہ لگایا تھا حالانکہ پی۔ ڈی۔ ایم اور جماعتِ اسلامی کے ہمدرد روزنامہ نوائے وقت تک نے اپنی انتہائی تفصیلی رپورٹ میں اس نام نہاد نعرے کا کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ روزنامہ مشرق کے سوا کسی دوسرے سرکاری یا غیر سرکاری اخبار یا خبر رساں ایجنسی تک نے اس نام نہاد نعرے کا ذکر نہیں کیا۔ صرف ایک اخبار نے جواب سے پہلے بھی اسلام کے مقدس نام کو اپنے کاروباری مقاصد کو فروغ دینے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے اس فریب کو اچھالا ہے۔

یہ تو فرض بھی نہیں کیا جا سکتا کہ دو لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں کچھ لوگ اسلام کے مقدس نام کو نعوذ باللہ مُردہ باد کہیں اور جماعت اسلامی اور ایک سرکاری ڈھنڈورچی کے علاوہ کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔ دراصل یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ جماعتِ اسلامی اسلام کے پاک نام کو محض اپنے عوام کو دھوکہ دینے والی سیاسی مقصد برآری کے لیے استعمال کرتی ہے۔ پیپلز پارٹی جس کا سب سے پہلا اصول ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ ہرگز ہرگز اسلام کے خلاف نعرہ نہیں لگا سکتی۔ اسلام کے خلاف نعرہ خود پیپلز پارٹی کے خلاف نعرہ ہے۔

ملک معراج خالد کا استعفیٰ

ملک معراج خالد ایم۔ پی۔ اے نے جو لاہور ہی نہیں، پاکستان کی ایک جانی

لاہور میں ڈاکٹروں کا احتجاجی جلوس

لاھور میں پاکستان پیپلز پارٹی کا مشعل بردار جلوس، احمد رضا قصوری قیادت کر رھے ھیں

پہچانی سیاسی شخصیت ہیں بالآخر مسلم لیگ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ملک صاحب کے استعفیٰ کا پس منظر یہ ہے کہ موجودہ عوامی تحریک کے دوران جب مغربی پاکستان کے سرمائی اجلاس کا انعقاد ہوا تو ملک صاحب نے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے سیکرٹری کو اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے ایک قرارداد روانہ کی۔ یہ قرارداد انھوں نے ملک کے تمام خبر رساں اداروں اور اخبارات کو بھی روانہ کی جس میں موجودہ تحریک کے اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا اور مسلم لیگ پارٹی کو بعض تجاویز پیش کی تھیں۔ یہ پوری قرارداد اس دفعہ کے نصرت میں من وعن شائع ہو رہی ہے۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ موجودہ حالات کی ذمہ داری ملک میں موجودہ معاشی نظام، شخصی حکومت اور اس سے پیدا ہونے والی بے شمار خرابیوں پر عاید ہوتی ہے اور اس سلسلے میں معاشی اور سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس قرارداد کا نام ہے ”ضمیر کا بحران“۔

یقیناً ملک صاحب اس اقدام کے نتائج سے بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی اتمامِ حجت کے لیے انھوں نے تمام صلح کُل ذرائع استعمال کیے لیکن مسلم لیگ کے کرتا دھرتا بھلا جمہوری آواز کو کہاں سنتے ہیں (چاہے وہ ان کے ایک قابلِ اعتماد ممبر اسمبلی ہی کی کیوں نہ ہو) ان کرتا دھرتاؤں نے ملک معراج خالد پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا، لالچ دیا اور اپنے تمام سابقہ اور موجودہ ہتھکنڈے استعمال کیے لیکن انھوں نے قرارداد واپس نہ لی۔ بالآخر انھیں پارٹی سے خارج کیے جانے کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن اس سے قبل ہی ملک صاحب نے یہ مناسب جانا کہ اس غیر دستوری، غیر جمہوری اور تعمیری تنقید تک سے گھبرانے والی جماعت سے استعفیٰ دے دیں۔ بارہ کروڑ عوام ان کے اس اقدام کا خیر مقدم کریں گے۔

دستوری اور جمہوری طریقوں کا ڈھنڈورا پیٹنے والی مسلم لیگ پارٹی کے دوسرے ارکان کے لیے بھی پارٹی کا یہ رویّہ عبرت ناک ہے اور اس امر کی توقع کی جاتی ہے کہ عوامی تحریک کے فروغ کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ پارٹی کے دوسرے ارکان بھی ضمیر کے بحران سے دوچار ہوں گے اور ملک صاحب کی راہ پر چل نکلیں گے۔

عوامی تحریک کے نتیجے میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکمران ٹولے کی آنکھیں کھلتیں اور وہ مفاہمت کی کوئی راہ اختیار کرتا، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ حکومت نے ہوشمندی سے کام لینے کے بجائے عوامی حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے طالب علموں اور دیگر حلقوں پر تشدد کا استعمال اور بھی شدید کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں تا دمِ تحریر تازہ ترین واقعہ ملتان کا ہے جہاں طالب علموں کو ہی نہیں اساتذہ تک کو پولیس نے کالجوں کی حدود میں گھس کر مارا پیٹا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس صورتِ حال کے خلاف سرکاری کالج کے اساتذہ کی ایسوسی ایشن تک نے احتجاج کیا اور حکومت کے اعلیٰ ارکان تک نے پولیس کے تشدد کی شکایت کی۔ لیکن اِدھر سرکاری کالج کے اساتذہ کی شکایات اخبارات میں پہنچیں اور اُدھر سرکاری ہینڈ آؤٹ میں اس حقیقت ہی سے انکار کر دیا گیا کہ پولیس کالجوں کی حدود میں داخل ہوئی۔

لاھور میں تحریک جمھوریت کا جلوس

ذوالفقار علی بھٹو
محمد حنیف رامے

سیاسی پارٹیاں

ذوالفقار علی بھٹو سے خصوصی انٹرویو

یہ دس نومبر ۱۹۶۸ء کی اتوار کا ذکر ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو سرحد کا معرکہ آرا دورہ ختم کر کے راولپنڈی سے لاہور تشریف لا چکے تھے اور آج ڈاکٹر مبشر حسن کی کوٹھی کے لان میں بیٹھے ایک ایسے فاتح کی طرح دھوپ میں سستا رہے تھے جس نے ابھی ابھی ایک اقلیم فتح کی ہو اور اگلے محاذ کے لیے اپنی طاقت جمع کر رہا ہو۔ سات ماہ کے جبری تعطل کے بعد "نصرت" کو چھپنے کی اجازت مل جانے کی خبر انہیں راولپنڈی ہی میں مل چکی تھی اور میں ان سے یہ وعدہ لے چکا تھا کہ لاہور آنے پر اُن سے ایک تفصیلی انٹرویو کروں گا۔ جب وہ لاہور پہنچے تو ملک کی فضا ہی بدل چکی تھی، اُن کی للکار پر قوم نے لبیک کہی تھی اور ملک کی سونی گلیاں عوامی مطالبات سے گونج رہی تھیں، ذوالفقار علی بھٹو آج بارہ کروڑ پاکستانی عوام کی اُسی طرح ترجمانی کر رہے تھے جیسے تین سال پہلے ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو سلامتی کونسل میں کی تھی۔ لوگ اُمڈ اُمڈ کر اُن سے ملنے چلے آ رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اتنی فرصت نہیں ملے گی کہ تفصیلی انٹرویو دے سکیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کے زبردست معترف ہیں کہ اگر ملک میں موجودہ لوٹ کھسوٹ اور یہاں کار فرما استحصالی نظامِ حکومت کو تبدیل کرنا ہے تو ہمیں اپنی اُن کوتاہیوں اور خامیوں کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لینا ہو گا جن کے باعث ہم اپنے عوام کو جگانے میں اور منظم کر کے عوامی جدوجہد کی راہ پر ڈالنے میں ناکام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غور و فکر بلکہ پڑھنے لکھنے کے لیے ضرور وقت نکالتے ہیں۔ چنانچہ ان پچھلے سالوں میں، جب وہ حکومت سے علیحدہ ہوئے انہوں نے جہاں ملک بھر کے دورے کیے، جلسوں سے خطاب کیا، ایک نئی پارٹی بنائی، اس کے پیچیدہ انتظامی اور تنظیمی امور کو سلجھایا وہاں انہوں نے کم از تین کتابیں بھی تیار کیں — نیو کولونیلزم — متھ آف انڈی پنڈنس ("جدید نو آبادیت، آزادی ڈھونگ"۔ یہ کتاب انگلستان میں چھپ رہی ہے)، پاکستان کی سیاسی حالت، (انگریزی - اُردو) اور "عوام کی عدالت میں" (یہ کتاب عنقریب لاہور سے شائع ہو جائے گی)۔

جب میں اُن سے انٹرویو کی نیت سے ملنے پہنچا اور انہوں نے خلافِ معمول میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھا تو مسکرا کر بولے "مجھے تو یہ کام یاد تھا، میں سمجھتا تھا کہ تم بھول گئے ہو۔ لیکن اچھا ہے کہ دونوں نہیں بھولے"!

ہم دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے تاکہ علیحدگی میں بات چیت ہو جائے۔ میں نے کہا: ہم نے ایک نئی پارٹی بنائی ہے۔ اس سے پہلے ملک میں اور بہت سی اپوزیشن پارٹیاں موجود تھیں۔ ایسی پارٹیاں بھی تھیں جن کا منشور سوشلزم پر مبنی ہے۔ ان سب پارٹیوں کے باوجود کل تک قوم سوئی ہوئی تھی اور مایوس تھی۔ ہر کوئی ڈر کے مارے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ مادرِ ملت کی انتخابی مہم کے وقتی ہنگامے کے بعد یہ کیفیت اتنی گہری ہو گئی تھی کہ اعلان تاشقند کے خلاف لاہور میں طلباء اور نوجوانوں نے گولیاں کھائیں لیکن کوئی تحریک نہ ابھر سکی۔ آپ نے اُسی ماحول میں لنگر اٹھایا ہے۔ ہم نے اُن تمام مشکلات کا سامنا کیا ہے جو اس ملک میں کسی عوامی تحریک کے اُبھار کے خلاف پیدا کی جا چکی ہیں، ہمیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ ہماری صفوں میں منافقوں کی بھرتی کی گئی، ہمارے پاس روپیہ نہیں تھا، کوئی روزنامہ نہیں تھا، اور ہمارے خلاف آمریت کی ساری مشینری اور اپوزیشن پارٹیوں کی بداعتمادی ایک ساتھ صف آرا تھیں۔ آج اس یک سالہ پارٹی نے آپ کی سرکردگی میں عوام کو بیدار کرنے میں مثالی کامیابی حاصل کی ہے، لیکن ہمیں اس بیداری کو جڑیں مہیا کرنی ہیں، ورنہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بیداری ایک وقتی ابال ثابت ہو اور جب یہ اُبال ختم ہو تو عوام پہلے سے بھی مایوس ہو جائیں۔ یہ جڑیں کس طرح پیدا ہوں گی؟

بھٹو صاحب نے کچھ دیر توقف کیا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے: "ساری بات اتنی ہے کہ جب تک کسی سیاسی پارٹی کی جڑیں عوام میں نہیں ہوتیں وہ نہ بیداری پیدا کر سکتی ہے نہ کسی عوامی جدوجہد کی قیادت کر سکتی ہے۔ بعض سیاسی جماعتیں یہ سمجھتی ہیں کہ چونکہ وہ عوام کا نام لیتی ہیں یا مذہب کے نام پر کام کرتی ہیں اس لیے عوام میں ان جڑیں موجود ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ جب تک عوام کی ترجمانی نہ کی جائے، ان کے مفادات کے لیے قربانی نہ دی جائے۔ عوام کا نام لے کر ہم عوام کو بیدار اور منظم نہیں کر سکتے۔ کیا موجودہ حکومت عوام کا نام نہیں لیتی، وہ بھی تو یہ ساری لوٹ کھسوٹ عوام کے نام پر ہی کر رہی ہے، یہ بنیادی جمہوریتیں بھی تو عوام کے نام پر ہی ان کے سر تھوپی گئی ہیں، جنگ بھی تو عوام ہی کے نام پر بند کی گئی تھی، اعلان تاشقند بھی عوام ہی نام پر کیا گیا تھا۔ کیا حکومت کے پاس ان سب کارناموں کے لیے اس کے سوا کوئی بہانہ ہے کہ سب کچھ عوام کے یا قوم کے مفاد کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ یہی حال مذہب کا ہے۔ بے شک اسلام ہمارے لیے اتحاد کا باعث ہے اور اسلام ہی ہمیں تحریکوں پر ابھارتا رہا ہے لیکن جب اسلام کا نام جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے لیا جا رہا ہو تو عوام کو کیسے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ کیا عوام سے اس لیے قربانی مانگی جائے گی کہ آؤ تمہیں ایک لوٹ کھسوٹ سے نکال کر دوسری لوٹ کھسوٹ کا شکار بنا دیں۔ پھر آج کے دور کے اپنے تقاضے ہیں۔ یہ عوامی بیداری کا دور ہے۔

نوجوانوں کی قیادت کا دور ہے، اس دور میں خود اسلامی دنیا کے اندر سوشلسٹ معاشرے قائم ہوئے ہیں، ہمارے ہی جیسے ایک پسماندہ ملک چین میں عوامی انقلاب برپا ہوا ہے اور اس نے شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی مظلوم اقوام جاگ اٹھی ہیں، ویت نام نے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی قوت کو میدان جنگ میں ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ اب عوام کو صرف ٹھوس کام سے بیدار کیا جا سکتا ہے اور صرف عوامی پروگرام پر منظم کیا جا سکتا ہے۔"

بھٹو صاحب دم لینے کے لیے رُکے۔ میں نے وضاحت چاہی: "جو اقوام ایک عرصے تک غلام رہی ہیں وہاں غلامی ختم ہو جانے کے بعد بھی جدید نوآبادیاتی نظام کے باعث صحیح عوامی قیادت نہیں ابھری، یا ابھری بھی ہے تو وہ فوجی اور اقتصادی امداد کے بل بوتے پر پروان چڑھنے والے سامراجی عزائم سے چھٹکارا نہیں پا سکی، کیا یہ حقیقت نہیں کہ سچی آزادی حاصل کرنے کے لیے یا فوجی اور اقتصادی سطح پر آزاد ہونے کے لیے جس طرح کی قیادت درکار ہے ابھی تک اس کا فقدان ہے۔ کیا آزادی کا یہ مرحلہ طویل جدوجہد کے بغیر آ سکتا ہے اور کیا ہماری سیاسی جماعتیں اس جدوجہد کے لیے تیار ہیں، اور اگر پاکستان پیپلز پارٹی نے اس طویل جدوجہد کی نیت نہ باندھی تو وہ اس منزل تک پاکستانی عوام کی قیادت کر سکے گی؟"

بھٹو صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں، انہوں نے کہنا شروع کیا: "جدوجہد کی تیاری ہی نہیں، جدوجہد میں کُودنا اصل بات ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت عوام کے لیے جدوجہد کا آغاز کرے تو آج کے عوامی بیداری کے دور میں اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا، عوام کی بیداری کا تو یہ حال ہے کہ عوام آگے ہیں اور ہماری عام سیاسی قیادت پیچھے رہ گئی ہے۔ ہماری سیاسی جماعتیں اسی لیے ناکام چلی آتی ہیں کہ انہوں نے دنیا کی سیاسی تاریخ کے بعض اہم اسباق کو نظرانداز کر رکھا ہے اور جدوجہد سے گریز کی راہیں تلاش کر رکھی ہیں ——

بھٹو صاحب نے سگار سُلگا لیا اور دوبارہ گویا ہوئے —— "ذرا ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلے کا جائزہ لیں۔ ہماری کوئی سیاسی جماعت آزادی کے لیے اُس طرح کی انقلابی مسلح جدوجہد سے نہیں گزری جس کی مثال روس، چین، الجزائر، کیوبا اور ویت نام کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اگر کوئی سیاسی جماعت ایسی جنگوں کی فضا میں پلی بڑھی ہو تو اس کی جڑیں عوام میں بہت گہری اتر جاتی ہیں اور اس کے اور عوام کے درمیان اعتماد کا رشتہ اٹل ہو جاتا ہے۔ قائداعظم کی مسلم لیگ نے پاکستان کے حصول کے لیے جو جنگ لڑی وہ قانونی اور دستوری جنگ تھی، کوئی مسلح جنگ نہیں تھی۔ پھر بھی قائداعظم اپنی اس جنگ کو اس حد تک لے آئے تھے کہ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے "ڈائرکٹ ایکشن" (راست اقدام) کا اعلان کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مسلم لیگ نے عوام کے اعتماد کو جیت لیا اور قائداعظم کے بعد بھی کچھ عرصے تک اس جماعت کا نام عوام کی نظروں میں عزت کے قابل رہا بلکہ اب بھی اس جماعت میں بعض لوگ محض اسی لیے شامل ہیں کہ یہ قائداعظم نے قائم کی تھی اور اس نے مسلمان عوام کی ترجمانی کے لیے مسلح جنگ نہیں تو اس سے قریب قریب پہنچنے کی ہمت ضرور کی تھی۔

سگار کی راکھ جھاڑ کر بھٹو صاحب نے بات جاری رکھی۔ اب ان کی گفتار روانی پکڑ چکی تھی اور میں خاموشی سے سُن رہا تھا: "پھر ہماری کوئی سیاسی جماعت کسی بیرونی جارحیت کے خلاف کسی مکمل جنگ کی آتشیں فضا سے بھی نہیں گزری۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہم بھارتی جارحیت سے نبردآزما ہوئے تو ان سترہ دنوں میں اس بات کے امکانات روشن ہو گئے تھے کہ ہمارے عوام کو متحد اور منظم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابھی یہ امکانات ٹھوس عمل میں ڈھلنے نہ پائے تھے کہ جنگ بند کر دی گئی اور یوں وہ ساری عوامی بیداری جو جنگ کے چیلنج نے ہمیں بخشی تھی ضائع ہو گئی۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ، فرانس، یوگوسلاویہ، جرمنی وغیرہ نے جس طرح بیرونی جارحیت کا طویل مقابلہ کیا اس سے وہاں کے لوگوں کو بھرپور موقع ملا کہ وہ سخت کوشش، پختہ کار اور ذمہ دار تنظیموں میں ڈھل جائیں۔

بھٹو صاحب کہہ رہے تھے —— "پھر ہماری کوئی سیاسی جماعت خانہ جنگی کے مصائب سے بھی نہیں گزری کہ اُسے اپنے قدموں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہونے کی اہلیت نصیب ہوتی۔ امریکہ، سپین، آئرلینڈ، روس اور چین کی خانہ جنگیوں نے وہاں کی تنظیموں کو ٹھوس بنیادیں مہیا کر دی تھیں ——"

میں نے کہا —— "بھٹو صاحب! ہمارے یہاں بھی ہندو مسلم فسادات نے خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔"

بھٹو صاحب نے کہا۔ "ہندو مسلم فسادات کی نوعیت فسادات ہی کی تھی، خانہ جنگی کی نہ تھی۔ خانہ جنگی کی کیفیت البتہ اُن دنوں ضرور پیدا ہو گئی تھی جب تقسیم کے اعلان کے بعد پنجاب میں خون خرابہ ہوا اور اس کے نتیجے میں ہجرتِ عامہ وقوع پذیر ہوئی۔ اگر یہ خون خرابہ اعلان تقسیم سے پہلے ہوتا تو اس کا تقسیم پر بھی اثر ہوتا اور پاکستان کی کانٹ چھانٹ نہ ہوتی۔ افسوس یہ ہے کہ یہ قتلِ عام ہونا ہی تھا تو صحیح وقت پر کیوں نہ ہوا کیونکہ قائداعظم کی سرکردگی میں مسلم لیگ اس منزل پر آ چکی تھی کہ وہ راست اقدام کر سکے اور خانہ جنگی کے مصائب سے گزر سکے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے مسلم لیگ اس دور میں اس نوعیت کے تجربے سے ایک حد تک گزری بھی تھی۔ اسی لیے اس نے مسلمانوں کی نظر میں اوّلین مقام حاصل کیا تھا۔ اس نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور جس تنظیم کا ثبوت دیا وہ اسی کا باعث تھا کہ وہ ان حالات سے نبردآزما ہونے کا تہیہ کر چکی تھی اور جس حد تک وہ ان حالات سے نبردآزما ہوئی اسی حد تک عوام میں اس کی جڑیں پیدا ہوئیں —— نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔ قائداعظم نے پارٹی کو ذہنی اور جسمانی طور سے ایک عظیم مقصد کے لیے قربانی دینے پر تیار کیا اور مسلم لیگ برصغیر میں مسلمانوں کی ترجمان بن گئی کیونکہ وہ عمل کے لیے تیار تھی اگرچہ اسے عمل کی بہت مختصر سی مدت نصیب ہوئی۔ یہ مدت چونکہ مختصر تھی اس لیے جب قائداعظم ہم سے جدا ہو گئے تو مسلم لیگ

جلد ہی یہ روح کھو بیٹھی اور انتشار کا شکار ہو گئی۔

بھٹو صاحب نے دم لیا۔ سگار کو دوبارہ سلگایا اور میں نے سوال کیا۔ "قائدِ اعظم کی مسلم لیگ تو عمل کی بھٹی میں زیادہ دیر نہ رہی اور انتشار کا شکار ہو گئی لیکن جہاں یہ عمل طویل مدت تک جاری رہا اور سیاسی جماعتیں اُن تین شرائط کے مطابق سرگرم عمل ہوئیں جو آپ نے بیان کی ہیں وہاں بھی اب یہ حالت ہے کہ تبدیلی کے نئے تقاضوں کے تحت نوجوان لوگ سیاسی جماعتوں سے بالا بالا جد و جہد کرتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی اور قومی تاریخ اگر مسلح انقلابی جد و جہد، مکمل جنگ یا خانہ جنگی کے تجربات کے باعث سیاسی جماعتوں کو ٹھوس بنیادیں مہیا کر بھی دے تو کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان سیاسی جماعتوں کو اپنی قیادت بحال رکھنے کے لیے آج کے عوامی مطالبوں کا ساتھ دینا ہو گا ورنہ وہ پیچھے رہ جائیں گی"؟

بھٹو صاحب نے کہا: "یہ بالکل درست ہے کہ بنیادیں گہری ہوں تو پارٹیوں کے لیے کام کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹھوس بنیادوں پر نت نئی تعمیر کرتے چلے جانا بھی ضروری ہے۔ سیاست کوئی واقعہ یا حادثہ نہیں ہوتی، یہ تو ایک جہدِ مسلسل ہے، ایک عملِ پیہم ہے، ایک مستقل اور متواتر عمل ہے۔ آج دنیا بھر کی سیاسی جماعتیں مشکل میں پڑی ہوئی ہیں بلکہ بعض جگہ وہ انتشار سے بھی دوچار ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک عرصے سے وہ تینوں شرائط جن کا ذکر ہوا ہے معاشرے کی طاقت کو کوئی چیلنج پیش نہیں کر رہیں۔ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۵ء میں ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے عمومی طور پر یورپ اور امریکہ میں بلکہ روس میں بھی امن و امان اور فارغ البالی کی کیفیت رہی ہے۔ ان علاقوں کی سیاسی جماعتیں اپنی آب و تاب کھو بیٹھی ہیں اور ان کا جوش و خروش تیزی سے ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔ وہ فارغ البالی اور آسائش کے زیرِ اثر دم توڑ رہی ہیں۔ ان ملکوں کے نوجوانوں کی بغاوت کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ پارٹیاں پرانی اور فرسودہ ہو گئی ہیں اور ان کے پیغام میں اتنی جان نہیں رہی کہ نوجوانوں کی تائید حاصل کر سکیں۔ آج اور گزشتہ کل میں بہت بُعد پیدا ہو چکا ہے۔ نوجوان نئی قیادت کے طلبگار ہیں جو جاندار اور سرگرم ہو۔ جو پارٹیاں گزشتہ بیس سال کے دورِ امن و آسودگی میں اپنا جذبہ کھو بیٹھی ہیں وہ اس انداز کی قیادت فراہم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتیں وہ اسی طرح اپنے ماضی کے کارناموں پر جینے کی کوشش کر رہی ہیں جس طرح قائدِ اعظم کے بعد کچھ عرصہ مسلم لیگ زندہ رہی تھی۔ انہی حالات کے صحیح تجزیے نے چیئرمین ماؤزے تنگ کو اپنے ملک میں ثقافتی انقلاب برپا کرنے کی راہ دکھائی تاکہ بحرانی دور میں پارٹی کو نئی زندگی اور طاقت بخشی جائے۔ اس کے بغیر اس گرد و غبار سے نجات نہ پائی جا سکتی تھی جس نے پارٹی کی آب و تاب کو ماند کر دیا تھا۔ یہ زنگ اتارنا ضروری تھا۔"

میں نے وضاحت چاہی ـــ "ہماری سیاسی جماعتیں نہ مسلح انقلابی جد و جہد سے گزری ہیں نہ مکمل جنگ یا خانہ جنگی سے۔ کیا ان حالات سے گزرے بغیر کوئی پارٹی عوام میں جڑیں پیدا نہیں کر سکتی"؟

بھٹو صاحب نے کہا: "اچھا ہوا تم نے یہ سوال کر ڈالا۔ مجھے بھی احساس تھا کہ میری بات کا غلط مطلب نہ لے لیا جائے۔ پہلے ہی مجھ پر بغاوت پھیلانے کا الزام ہے۔ بھائی، میں نے ان تین حالتوں کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ پیدا کرنی چاہئیں۔ میں نے تو ان حالتوں کے اثرات کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے قیام اور استحکام پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ ملک میں جو بھی حالت رائج ہو اس کا پورے معاشرے پر اچھا یا بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور سیاسی پارٹیاں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ جنگ اور امن کی حالتوں کا بھی حالات کے بہاؤ پر اچھا اثر اور بُرا اثر پڑتا ہے۔ فارغ البالی اور آسودگی نے بعض معاشروں کو خوشی بھی دی ہے لیکن ساتھ ہی ان کے باعث وہاں جرائم کی ایک نئی لہر بھی اٹھ کھڑی ہوئی ہے بلکہ زیادہ خوش حال معاشروں میں خودکشی کی شرح بھی زیادہ ہے جو ظاہر ہے کہ معاشرتی عدمِ استحکام ہی کا نتیجہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ امن کی جگہ دنیا میں جنگ چھڑ جائے۔ ہم امن چاہتے ہیں۔ ماؤزے تنگ نے بھی امن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ایک ایسا بحران پیدا کر کے ان تین شرائط کے فوائد حاصل کیے ہیں جس کو بے قابو نہیں ہونے دیا گیا۔ اگر قیادت میں فراست ہو تو جس طرح ماؤزے تنگ نے امن کو تباہ کیے بغیر ثقافتی انقلاب برپا کر کے اس کے فائدے حاصل کیے ہیں اسی طرح دوسری جگہوں پر بھی جذبات کو ابھار کر ایک ایسے بحران کی حالت پیدا کی جا سکتی ہے جس سے سیاسی زندگی میں تازگی آ جائے۔ اسی طرح کے مزید طریقے آزمائے جا سکتے ہیں جن سے پُر امن رہتے ہوئے بھی فرسودگی اور انتشار کی طاقتوں کو لگام دی جا سکے۔"

میں نے کہا۔ "ہماری سیاسی پارٹیوں کی آخر کیا روایت ہے؟ وہ مسلح انقلابی جد و جہد سے گزری ہیں، نہ مکمل جنگ اور خانہ جنگی ہے اور نہ انہوں نے امن کی چار دیواری ہی میں کسی ایسے بحران کو جنم دیا ہے جو فرسودگی اور انتشار کو ختم کر کے ہماری سیاسی زندگی کو تازگی بخشتا۔"

بھٹو صاحب نے کہا۔ "جب سے برطانیہ نے ہندوستان فتح کیا، ہمارے یہاں یہ تینوں حالتیں پیدا نہ ہوئیں اس لیے منظم انقلابی پارٹیوں کی کوئی روایت نہ پنپ سکی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا اندازِ نظر مثبت کے بجائے خود غرضانہ حد تک منفی سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ ہر سیاسی جماعت اقتدار چاہتی ہے۔ لیکن ہماری روایت یہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اقتدار اس لیے نہیں چاہتیں کہ معاشرے میں کوئی تبدیلی لائیں بلکہ محض اس لیے کہ اختیار اور مراعات حاصل کر سکیں۔ انہیں اقتدار بغیر کسی قربانی کے نصیب ہو جاتا رہا ہے اس لیے اقتدار کے بارے میں ان کا تصور نہایت محدود اور ذاتی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ ذاتی اقتدار کے اس محدود

تصور کے باعث وہ اپنی تنظیم کو مضبوط نہیں کر سکیں اور نہ کسی بلند مقصد کے لیے قربانی کا جذبہ ابھار سکی ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی صفوں میں کبھی تطہیر نہیں کی، کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیسے کیسے عناصر ان میں گھس آئے ہیں، انہوں نے کبھی کھرے انتخاب کی زحمت نہیں اٹھائی۔ اقتدار کی دوڑ میں انہوں نے کام نکالنے کے لیے گائے، گدھا ایک سمجھا ہے اور مقدار کے مقابلے میں معیار کی پروا نہیں کی۔ انہوں نے اصولوں پر ہر طرح کی سمجھوتے بازی روا رکھی ہے اور ہر موقع پرستانہ مفاد اور ابن الوقت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا ہے۔ انہوں نے ہر قیمت پر اقتدار چاہا ہے۔ ان کی سوچ، ان کی نظر، ان کی سکت محدود تھی اور محدود مقاصد پر ہی مرکوز رہی ہے۔ کسی دو ٹوک اور اور ناقابلِ تنسیخ مقصدِ عظیم کے لیے ایک طویل المدت مسلسل جدوجہد کے قربانیوں بھرے راستے کا تصور بھی انہیں چھو نہیں گیا۔ وہ معاشرتی اور اقتصادی مقاصد کے حصول کے لیے کسی سائنٹیفک اندازِ نظر کو قبول کرنے پر تیار ہی نہیں۔ نہ انہیں کسی ایسی جدید تنظیم کا تصور ہی بھاتا ہے جو گہرے نظم و ضبط کی حامل ہو اور اسے کسی مقصد کی بھرپور لگن ہو۔ جب نہ آدرش ہوں، نہ مقصد کی لگن ہو تو پھر نہ کارکن ہی تربیت پاتے ہیں، نہ کوئی مکتبۂ فکر ابھرتا ہے اور نہ پارٹی کا پیغام دور و نزدیک تک پہنچانے کے لیے جوش و خروش مہیا ہوتا ہے۔ ان کے منشوروں میں دیانت سے زیادہ منافقت کا دخل ہے جو صرف انتخابات کے پیشِ نظر مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی عمر طبعی ایک الیکشن سے دوسرے الیکشن تک ہوتی ہے۔ ہماری جماعتیں گھسی پٹی باتیں کرنے اور قرار دادیں منظور کرنے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ اقتدار کے حصول کے لیے وہ ہر کسی کو خوش کرنے کی روش پر چل نکلتی ہیں۔ لیکن جب اقتدار مل جاتا ہے تو سیاسی جماعت کا مقصد یہ رہ جاتا ہے کہ اقربا نوازی کا ذریعہ بن جائے۔ برسرِ اقتدار پارٹیاں اپنے محدود اور بدترین معنوں میں کنبہ پروری اور اقربا نوازی کے اڈے بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے، یا پھر کوئی اور وجہ ہے تو اس کا بھی اسی سے تعلق ہے، کہ برسرِ اقتدار پارٹیوں کی عوام میں کوئی جڑیں نہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے کسی نہ کسی بیرونی طاقت پر انحصار کرتی ہیں۔

بھٹو صاحب کچھ دیر کے لیے رُکے، پھر کہنے لگے ”جس لمحے سے مسلم لیگ نے عوامی تائید ہاتھ سے گنوائی اُسی لمحے سے خلا کو پُر کرنے کے لیے بیرونی مداخلت در آئی اور نوکر شاہی نے پر پُرزے نکال لیے۔ عوامی تائید گنوانے کے بعد اور جڑوں کے فقدان کے باعث برسرِ اقتدار گروہ نے عوام کی جماعتوں میں نئی روح پھونکنے کے بجائے اندرونِ ملک نوکر شاہی کے ساتھ اور بیرونِ ملک سامراجی طاقتوں کے ساتھ اس شرط پر سمجھوتے بازی کر لی کہ ملک کا اقتدار بہر حال اسی گروہ کے ہاتھ میں رہے گا۔ برسرِ اقتدار جماعت کے خود غرضانہ مقاصد نے بیرونی مداخلت کے عنصر کو پاکستان میں بلا روک ٹوک پھولنے پھلنے کی مہلت دے دی تاکہ بیرونی امداد کے سہارے وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکے اور اُن عوام کو جو اس کے خلاف ہو چکے ہیں دبا سکے۔ بیرونی طاقتوں کے مفادات ضروری نہیں کہ ہمارے قومی مفادات سے ہم آہنگ ہوں بلکہ محض اس وجہ سے کہ وہ برسرِ اقتدار حکومت کو امداد دیتی ہیں حکومت کو اپنے ڈھب کے فیصلے کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ عوامی تائید اور عوامی تنظیموں کی عدم موجودگی میں حکومت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ بیرونی طاقتوں کی شرائط کو قبول کرے خواہ وہ قومی مفادات کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں اور یوں وہ برسرِ اقتدار رہنے کے لیے عوام دشمن اور قوم دشمن پالیسیوں کو زیرِ عمل لاتی رہتی ہے کیونکہ اقتدار ہی اُس کا خدا ہوتا ہے۔ اسی صورتِ حال کے باعث بے لگام بدعنوانی، سمگلنگ، کنبہ پروری اور دوسری برائیاں ہمارے معاشرے میں گھس آئی ہیں۔“

بھٹو صاحب رک گئے۔ چائے آگئی تھی۔ میں نے چائے بنائی۔ اتنے میں پتہ چلا کہ طلباء کا ایک وفد باہر منتظر ہے۔ بھٹو صاحب نے مجھے اشارے سے کمرے ہی میں انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود باہر تشریف لے گئے۔ میں نے بمشکل چائے کی پیالی ختم کی تھی کہ وہ واپس آگئے۔ میں نے انہیں گھنٹوں تقریر کرتے بھی دیکھا ہے کہ لوگ سنتے ہی چلے جاتے ہیں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ انہوں نے عوام کے سامنے دو جملے ادا کیے اور لوگ مطمئن ہو گئے۔ اس وقت وہ طلباء کے وفد کو یقیناً کسی ایسے ہی مختصر لیکن جاندار اور دل میں اتر جانے والے پیغام سے نواز کر آ رہے تھے۔ میں نے سوال کیا ”آپ نے ہماری سیاسی جماعتوں کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ برسرِ اقتدار رہنے والی جماعتوں پر تو صادق آتا ہے لیکن ہمارے یہاں ایسی اپوزیشن جماعتیں بھی ہیں جو کبھی برسرِ اقتدار نہیں آئیں۔ کیا ہماری جماعتوں کی کوتاہیوں اور اقتدار کے بُرے اثرات کے درمیان ایک خاص تعلق نہیں ——“

بھٹو صاحب نے جواب دیا ”اپوزیشن پارٹیاں بھی اُن حالات سے نہیں گزریں جو سیاسی جماعتوں کو جڑیں عطا کرتے ہیں۔ وہ بھی انقلابی روایات کے سایے تلے پروان نہیں چڑھیں۔ ان میں بھی قریب قریب وہی کوتاہیاں ہیں جو قائدِ اعظم کے بعد برسرِ اقتدار رہنے والی جماعتوں میں دیکھی گئی ہیں۔ یوں بھی جب ہم سیاسی جماعتوں کی بات کر رہے ہیں تو میرے سامنے صرف موجودہ برسرِ اقتدار جماعت ہی نہیں بلکہ سب جماعتیں ہیں۔ اور اس موضوع میں میری دلچسپی یہی ہے کہ ہم نے بھی ایک سیاسی جماعت بنائی ہے۔ اگر ہم نے بھی وہی روش اختیار کی جو اس سے پہلے کی جماعتوں نے اپنا رکھی ہے تو ہماری کیفیت بھی وہی ہو گی جو اُن کی ہے۔ میں تنقید اور خود تنقیدی کا قائل ہوں۔ اور اسی جذبے سے یہ باتیں کر رہا ہوں۔ ہاں تو، میں کہہ رہا ہوں کہ اپوزیشن پارٹیاں بھی اسی مرض کا شکار ہیں البتہ ان میں وہ واقعاتی برائیاں نہیں ہیں جو خالصتاً اقتدار کی پیداوار ہیں۔ نہ یہ پارٹیاں اقتدار میں آئیں نہ ان میں وہ برائیاں پیدا ہوئیں جو اقتدار اور عہدے کے استعمال ہی سے خاص ہیں لیکن یہ پارٹیاں اگر اقتدار میں آ جائیں تو یہ کہنا محلِ نظر ہے کہ وہ ان برائیوں سے دامن بچا سکیں گی۔ ان میں سے بعض کو دوسروں سے ہر قیمت پر سمجھوتا کرنے کی ایسی جلدی پڑی ہوئی ہے جیسے ان کے اپنے کچھ اصول ہی نہ ہوں۔ یہ کوئی قابلِ قدر صفت نہیں۔ پھر ان میں بہت سے تنظیمی، تدبیری اور اصولی جھمیلے ہیں۔ وہ ابھی تک انہی طور طریق سے چمٹی

ہوئی ہیں جو برطانوی عہد میں تشکیل پائے تھے۔ حالات بدل گئے ہیں لیکن ان کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، وہ ابھی تک قبل از تقسیم دَور کی سیاست کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کا سارا زور ابھی تک قراردادوں اور بیانوں پر صرف ہوتا ہے یا کبھی کبھار کوئی جلسہ اور جلوس ہو گیا، بہت ہُوا تو یومِ ایں یا یومِ آں منا لیا۔ وہ عمل کی جماعتیں نہیں۔ وہ جرأت مندانہ اقدامات نہیں کرتیں۔ وہ نئے حالات کو جنم نہیں دیتیں۔ اس کے بجائے وہ انتظار کرتی ہیں کہ نئے حالات پیدا ہو جائیں۔ اور جب یہ حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو اعلان کر دیتی ہیں کہ یہ ہماری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تم دیکھ لینا، یہ جو آج ہم نے پورے ملک میں عوامی بیداری کے لیے جہاد کیا ہے اس کا کریڈٹ لینے کے لیے کون کون اب بھاگا نہیں چلا آئے گا۔ خیر، وہ کسی مسلسل اور طویل المدت جدوجہد کو بروئے کار نہیں لاتیں اور نہ ہی کارکنوں کی تربیت کرتی ہیں۔

بھٹو صاحب نے بات جاری رکھی۔ "اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ جو اپوزیشن جماعتیں اقتدار میں نہیں رہیں ان پر یہ الزام تو نہیں آسکتا کہ وہ فلاں فلاں بدعنوانی کی مرتکب ہوئیں لیکن ان میں برسرِ اقتدار جماعت کے مقابلے میں یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ وہ انتظامی تجربے سے نابلد اور اس علم اور اہلیت سے محروم رہ جاتی ہیں جو اختیار کو زیرِ عمل لانے سے پیدا ہوتی ہے۔ عوام کی امنگوں کی ترجمانی اور قوم کے مقدر کی رہنمائی جیسی وسیع ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو پارٹی مسلح جدوجہد کے انقلابی پس منظر کی حامل ہو یا وہ پُرامن بحران پیدا کر سکتی ہو یا اُسے حکمرانی کا تجربہ ہو۔ جن سیاسی پارٹیوں نے کبھی حکومت نہیں کی وہ نہ تو انقلابی جدوجہد سے گزری ہیں اور نہ انہیں حکمرانی کا تجربہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدوجہد سے عاری ہیں۔ یا تو وہ بہت ہی لچکدار ہیں یا بالکل بے لچک ہیں۔ ان کی سوچ میں طرح طرح کی اُلجھنیں ہیں اور ان کے منہ کا ذائقہ بگڑ چکا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتی ہیں کہ اقتدار آسانی سے ہاتھ آجائے گا یا پھر انہیں اس خیال سے اقتدار میں دلچسپی ہی نہیں کہ ابھی حالات بہت عرصے میں جاکر دُرست ہوں گے۔ ان میں سے کچھ صرف یہ چاہتی ہیں کہ حکومت پر دباؤ ڈال کر چھوٹی چھوٹی مراعات حاصل کر لی جائیں یا دوسرے لفظوں میں اپوزیشن کے مشکل کام کو مزید مشکل بنا دیں۔ ان کے مقاصد یا تو اتنے بلند ہوتے ہیں کہ وہ قومی مقاصد سے بھی بالا ہو جاتے ہیں یا اتنے محدود کہ علاقائیت بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں کہ کوئی ایسا لائحہ عمل بھی ہو سکتا ہے جو ہمارے بین الاقوامی، قومی اور علاقائی مفادات پر یکساں حاوی ہو۔ ان میں طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے توازن کا اس حد تک فقدان ہے کہ بحرانی دور میں بھی متحد نہیں ہو سکتیں۔ بعض اوقات تو وہ اہم قومی مفادات پر یکجا ہونے سے گریز کرتی ہیں اور بعض اوقات ذرا ذرا سی بات پر سمجھوتے بازی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ان میں پروازِ تخیل، جرأت مندی اور وُسعتِ نظر کی کمی ہے۔ وہ تبدیلی کے لیے تو بے قرار ہیں لیکن قربانی دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ گھڑی میں مایوس ہو جاتی اور گھڑی میں جوش میں آجاتی ہیں۔ وہ جچے تلے منصوبوں کے تحت کام نہیں کرتیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ اپنی پالیسیاں بدل کر حالات کا ساتھ دینے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہماری سیاسی جماعتوں نے ہماری تاریخ میں کوئی ٹھوس کارنامہ انجام نہیں دیا۔"

بھٹو صاحب نے کہا۔ "شاید تم قائدِاعظم کی مسلم لیگ کے اس کارنامے کا ذکر کرنا چاہتے ہو جو قیامِ پاکستان کی صُورت میں تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ لیکن اس کارنامے کی نوعیت ایک تحریک کی ہے، سیاسی پارٹیوں کے رواجی کام کی نہیں۔ غور سے دیکھا جائے تو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کی تشکیل میں سیاسی پارٹیوں کے مقابلے میں تحریکوں نے زیادہ حصہ لیا ہے۔ عوام مسلم لیگ کے جھنڈے تلے بھی اسی لیے جمع ہو گئے تھے کہ اس نے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی تو مسلم لیگ موجود تھی لیکن سر آغا خان اور نواب سلیم اللہ کی مسلم لیگ اور قائدِاعظم کی مسلم لیگ میں بہت فرق ہے۔"

میں نے کہا۔ "سیاسی جماعتوں کی اس خراب و خستہ حالت نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر رکھی ہے۔ بہت سے لوگ، جن میں کئی قومی شخصیتیں بھی شامل ہیں، سیاست میں حصہ لینا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی سیاسی جماعت کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔ اس سے ہماری سیاسی زندگی میں کوئی تازگی پیدا نہیں ہو رہی بلکہ آہستہ آہستہ سیاست، جو معاشرتی زندگی کا سب سے اہم عمل تھا، لوگوں کی نظر سے گِرتی جا رہی ہے۔ مجھے وہ دِن بھی یاد ہے جب آپ حکومت سے علیحدہ ہو کر یورپ میں "چھٹی گزارنے" کے بعد ابھی لاہور آئے تھے اور میں آپ کے پاس یہ تجویز لے کر گیا تھا کہ آپ اسلامی سوشلزم کے پروگرام پر نئی سیاسی پارٹی بنائیں۔ اُس دِن سے لے کر یکم دسمبر ۱۹۶۷ء تک آپ اس سوچ میں رہے کہ پارٹی بنائی جائے یا نہیں اور بنائی جائے تو کب۔ ظاہر ہے کہ آپ نے اس دوران میں دوسری جماعتوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور ان جماعتوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی ہوگی کہ آپ ان میں شامل ہو جائیں۔ لیکن آپ نے بالآخر کسی دوسری جماعت میں شامل ہونے کے بجائے اسلام، جمہوریت، سوشلزم کے پروگرام پر ایک نئی پارٹی بنانا پسند کیا۔ سوال یہ ہے کہ جو اور سرکردہ لوگ سیاست میں آنا چاہتے ہیں کیا ان کے لیے بھی یہی مسئلہ نہیں کہ کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائیں یا اپنی نئی جماعت بنائیں۔

اور کیا یہ صورت حال ہماری سیاسی زندگی میں مزید انتشار نہیں پیدا کرے گی کہ وہ سب بھی نئی پارٹیاں قائم کر لیں۔ ہماری سیاسی جماعتوں کی زبوں حالی واقعی ایسی ہے کہ کسی قومی شخصیت کو کسی پارٹی میں شامل ہوتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ حکمران جماعت بیرونی طاقتوں کے جدید نوآبادیاتی طرزِ عمل کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے اور غیر عوامی پالیسیوں پر چل رہی ہے۔ ادھر اپوزیشن جماعتیں انتشار کا شکار ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی تین گروہوں میں منقسم ہے اور ان میں سے دو بڑے گروہوں کو بلا جھجک "ماسکو نیپ" اور "پیکنگ نیپ" کا نام دے دیا گیا ہے ـــ کسی محبِ وطن قومی جماعت کے لیے یہ بات کتنی معیوب ہے۔ عوامی لیگ بھی تین گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑ رہی ہے۔ جوڑ توڑ اور شخصی اختلافات نے کونسل لیگ کو بھی معطل کر رکھا ہے۔ نظام اسلام کا مطلب ہے دو آدمی۔ صرف جماعت اسلامی ایسی پارٹی ہے جو اپنے آپ کو منظم کر رہی ہے لیکن اس کے خمیر میں کچھ ایسی غیر عوامیت ہے کہ یہ بھی اپنی آرزوؤں کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں لوگ سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے سے گریز نہ کریں تو کیا کریں۔

حالانکہ اپنے اصُولوں کے فروغ کے لیے کسی پارٹی میں شامل ہونا ہر فرد کے لیے باعثِ عزّت ہونا چاہیئے۔"

بھٹو صاحب نے کہا ”لوگ سیاسی پارٹیوں سے کتنا ہی اجتناب کریں سیاسی پارٹیوں کے بغیر کاروبارِ سیاست نہیں چل سکتا۔ صدر ایوب بھی یہی کہا کرتے تھے کہ پارٹیوں کے بغیر کام چل جائے گا لیکن بالآخر انہیں اپنے الفاظ واپس لینے پڑے اور انہوں نے ۱۹۶۲ء میں اپنی پارٹی بنالی۔ جن قومی شخصیتوں کی تم بات کر رہے ہو وہ بھی سیاست میں تو آنا چاہتی ہیں لیکن سیاسی پارٹیوں میں شامل ہونے سے گریز کر رہی ہیں۔ اگر ان لوگوں نے سیاست میں رہنا ہے تو انہیں بالآخر کسی نہ کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا پڑے گا یا وہ بھی نئی سیاسی پارٹی بنانے پر مجبُور ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا ”کیا سارا قصُور سیاسی جماعتوں ہی کا ہے یا ملک کے حالات کا بھی کچھ عمل دخل ہے کہ لوگ سیاسی جماعتوں سے دامن چُراتے ہیں“۔

بھٹو صاحب نے کہا ”ہاں، کچھ حالات کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ ایک پسماندہ اور نو آزاد ملک کو گوناگوں سیاسی اور اقتصادی مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ پھر وہ مسائل ہوتے ہیں جن کا تعلق دستور سے ہے اور ان کے علاوہ علاقائی اور مرکزی مطالبات کے درمیان توازن قائم رکھنے کا مسئلہ ہوتا ہے۔ قیادت ان طرح طرح کے مسائل میں گھری ہوتی ہے اگر ایک نقطۂ نظر کی حمایت کرتی ہے تو دُوسرے سب رُوٹھ جاتے ہیں۔ اس طرح آئے دن پالیسیوں میں کانٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے۔ اگر کوئی غیر معمولی صُورتِ حال کسی قومی ہیرو کو جنم دے دیتی ہے تو یہ قومی ہیرو فطری طور پر یہ سوچتا ہے کہ مجھے جو غیر معمولی اور یگانہ قومی حیثیت حاصل ہے میں اُسے کسی ایک گروہ یا پارٹی سے وابستہ ہو کر کیوں ہاتھ سے گنوا دُوں۔ لوگ تو اچھے بھلے وقتوں میں کسی قول و قرار سے ڈرتے ہیں، پھر کوئی قومی ہیرو اس بات سے کیوں خائف نہ ہوگا کہ اگر میں نے اپنے خیالات اور عزائم واضح کر دیے اور اپنے ہم خیالوں سے جا ملا تو میری وہ ہردلعزیزی جو اس وقت پوری قوم میں موجود ہے محدُود ہو کر رہ جائے گی۔ اُس کا یہ ڈر ان حالات میں اور بھی بجا ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی جماعتوں کی شہرت اچھی نہیں بلکہ بُری ہے۔ پھر وُہ کیوں کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو، اس کا اس میں کیا فائدہ ہے، بلکہ نقصان ہی نقصان ہے اور کوئی بھی اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔ وہ قومی ہیرو جس کو پُوری قوم عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہو وہ اپنی شہرت کو اپنے ہاتھوں سے کیوں گھٹائے گا۔ پاکستان میں تو برسرِ اقتدار حکومت نے حالات ہی ایسے بنا دیے ہیں کہ آپ کو بالکل متضاد اور متصادم نظریات اور پالیسیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے قوم کسی بھی مسئلے پر متفق نہیں ہو سکتی۔ سیاست میں آنے کا مطلب ہے کہ آپ یہ بتائیں کہ چھ نکات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، آپ ون یونٹ قائم رکھنا چاہتے ہیں یا توڑنا، کون سے طرزِ حکُومت کو پسند کرتے ہیں، دستور کے بارے میں کیا رائے ہے اور جونہی آپ نے زبان کھولی وہ قوم جو پہلے آپ کی تعریف میں یک زبان تھی۔ آپ کی حمایت اور مخالفت میں بٹ جائے گی“۔

میں نے کہا ”آخر آپ نے بھی تو یہ مرحلہ طے کیا ہے، آپ سے بڑا قومی ہیرو اور کون تھا۔ قائداعظم کے بعد شاید ہی کسی فردِ واحد سے قوم نے اتنا پیار کیا ہو جتنا آپ سے۔ ان حالات میں تو آپ کو بھی یہ آسان نظر آتا ہوگا کہ قومی ہردلعزیزی کی ٹھنڈی چھاؤں میں قومی مسائل کے تپتے میدانوں سے دُور، آرام سے بیٹھے رہیں۔ پھر آپ نے یہ جرأتِ رندانہ کیونکر کی۔“

بھٹو صاحب نے کہا ”ہاں، غیر معمولی حالات نے مجھے بھی قومی ہیرو کی حیثیت دے دی تھی حالانکہ آمریت میں عوام کی نظر میں آنا خودکشی کے برابر ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ مجھے سیاسی جماعتوں کی ان کوتاہیوں کی خبر نہ تھی جن کا ذکر آچکا ہے یا ان نقصانات کا احساس نہ تھا جو کسی قومی ہیرو کو کسی ایک جماعت میں شامل ہونے سے ہو سکتے تھے۔ ان نقصانات کے شمار کا یہ وقت نہیں اور نہ ہی ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے نہ صرف سیاست میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا بلکہ ایک نئی پارٹی کی تشکیل کی۔“

میں نے کہا ”آپ نے کسی دُوسری پارٹی میں شامل ہونے کے بجائے نئی پارٹی کیوں بنائی؟

بھٹو صاحب نے کہا ”جب میں نے تمام پارٹیوں کے اندرُونی اور باہمی خلفشار کو اچھی طرح دیکھ لیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اپنی موجودہ حالت میں ان کے درمیان کوئی اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ میں سوشلسٹ ہوں۔ اسی لیے دائیں بازُو کی جماعتوں میں میری شمولیت بے معنی تھی۔ سوشلسٹ جماعت نیشنل عوامی پارٹی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ دائیں بازو کی جماعتیں پی ڈی ایم کی صورت میں ضرور متحد ہو چکی تھیں لیکن بائیں بازو میں شدید انتشار تھا۔ بائیں بازُو اور تمام قوم پرست عناصر کو یکجا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ نئی قیادت فراہم کی جائے۔ ضروری تھا کہ ایسی باعمل جماعت قائم کی جائے جو عوامی جدوجہد کا آغاز کرے تمام عوامی طاقتوں کو یکجا کر دے۔ جب تک بایاں بازُو اور تمام قوم پرست عناصر متحد نہیں ہوتے اس وقت تک دائیں بازو سے ان کا باعزت اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بے حد ضرُوری ہے کہ ملک میں جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے تمام اپوزیشن مل کر کام کرے۔ اگر اس معاملے میں بائیں بازو کی جماعتیں بے عمل رہتی ہیں تو سوشلسٹ معاشرے کا قیام مزید دُور جا پڑتا ہے بلکہ جمہوری حقوق کی بحالی کی مہم بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”جب آپ نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو آپ کو کن حالات سے دوچار ہونا پڑا؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس نئی پارٹی کی مخالفت صرف حکُومت کی جانب سے نہیں دوسری اپوزیشن جماعتوں کی طرف سے بھی ہوئی کیونکہ وہ آپ کے اس اقدام کو اپوزیشن میں اتحاد کے بجائے اپوزیشن میں انتشار کے رنگ میں دیکھتی رہیں۔“

بھٹو صاحب نے کہا ”کسی ایسے شخص کے لیے جس کی پوری قوم میں عزت تھی یہ بہت مشکل مرحلہ تھا کہ وہ ایک نئی پارٹی بنا کر اپنی شہرت کو محدُود کرے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ آمرانہ حکومت اُسے کچلنے پر تُلی ہو اور اپوزیشن جماعتیں بھی اُسے ہمدردی اور تعاون سے نوازنے پر تیار نہ ہوں۔ پھر ہمارے پاس نہ فنڈ تھا، نہ بیرُونی تائید، نہ کوئی رُوزنامہ۔ یوں سمجھو کہ ہمیں الف سے شروع ہونا تھا۔ میرے سامنے صرف مشکلات اور تکلیفات تھیں۔ کہیں سے حوصلہ افزائی کی اُمید نہ تھی۔ لیکن میں نے ہر طرح کے

خطرات کو قبول کرتے ہوئے پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں "آزاد" رہنا چاہتا تو رہ سکتا تھا لیکن جو لوگ میرے گرد جمع ہوتے میں ان کو کوئی لائحہ عمل نہ دے سکتا۔ یہ ضروری تھا کہ میں پارٹی بناتا اور اپنے ہمنواؤں کی قوتوں کو کسی لائحہ عمل کی کامیابی کے لیے سرگرم عمل کرنے کی سبیل پیدا کرتا۔ اگر میں "آزاد" رہتا تو میری دانست میں یہ آخر کار ایک غیر اخلاقی فعل ہوتا۔ مجھے جن غیر معمولی حالات نے قوم کی نظر میں وقار بخشا تھا یہ ان حالات کا ناجائز فائدہ اٹھانے کے مترادف ہوتا۔ میں کوئی فلم سٹار نہیں تھا، لوگ مجھے قومی ہیرو مانتے تھے اور مجھے کسی حقیقی ہیرو کی طرح لوگوں کی توقعات پر پورا اترنا چاہیئے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں بادلوں سے اتر آؤں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اپنے موقف کا وانشگاف اعلان کروں، اس کا مطلب تھا کہ میں یہ بتاؤں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس کے خلاف، اس کا مطلب تھا کہ بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو جائیں اور بہت سے بددل۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ میں اپنے آدرش کی تکمیل کا ٹھوس راستہ اختیار کروں جو ظاہر ہے کہ ہوا کے دوش پر سوار رہتے ہوئے نہیں کیا جا سکتا۔

بھٹو صاحب نے بات جاری رکھی — "قیادت بہت اہم ہے لیکن تنظیم کے بغیر بیسویں صدی میں کوئی قائد کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر دیکھا جائے تو خدا کے رسولوں کو بھی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی پھر آج کے وہ قائد جو معاشرتی حالات کو بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں تنظیم کے بغیر کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں تنظیم کے ساتھ ساتھ قیادت کے پاس ایک نظریہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ عمل کے لیے جو راہیں تراشی جائیں وہ منزل کی طرف ہی جائیں، ہمیں گمراہ نہ کر دیں۔ اس سے بڑی بددیانتی کیا ہو سکتی ہے کہ عوام کو مستقبل کے بارے میں، ان کی آئندہ نسلوں کے مقدر کے بارے میں گمراہ کیا جائے۔ جو قائد انقلاب آفریں اصلاح چاہتا ہے اور اقتدار کی ہوس کا شکار نہیں، اقتدار اپنے لیے نہیں بلکہ معاشرے کے حالات بدلنے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ نظریے اور تنظیم کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ اور نظریے اور تنظیم کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی پارٹی بنائی جائے۔ سیاسی پارٹی کی صورت میں قیادت، نظریہ اور تنظیم یکجا ہو جاتے ہیں اور ان تینوں عناصر کی یکجائی خواہ اس میں افراد کے لیے کچھ نقصانات بھی ہوں، عوامی خدمت پر مبنی مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص ان مقاصد کا دعویٰ کرتا ہے اور سیاسی پارٹی سے دامن چراتا ہے، تو میری عاجزانہ رائے میں وہ تضاد کا شکار ہے۔ ہر اس بااصول اور قومی لگن رکھنے والے شخص کے لیے جو مفاد پرست نہیں یا جو محض فوری اور ہنگامی مقاصد نہیں رکھتا یہ لازم ہے کہ وہ کھل کر سامنے آئے اور سیاسی طور پر "یہ سامنے آنا" کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔ سیاسی پارٹی کسی مشترکہ مقصد پر ہم خیال لوگوں کا اجتماع ہوتی ہے جو اس مقصد کے لیے عوام سے تائید حاصل کرتی ہے۔ "ہم خیال لوگوں کے اجتماع" سے بھی بڑھ چڑھ سیاسی پارٹی کا مطلب ہوتا ہے — اصول' — اس کا مطلب ہوتا ہے — قربانی'، یہ بدی کے خلاف ایک طویل المدت مسلسل جدوجہد ہوتی ہے، یہ عوام کی جیتی جاگتی آواز ہوتی ہے۔ یہ انقلاب کا پرچم اور آرزوؤں کا منبع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی پارٹی کی صورت میں سیاسی افراد ضروری ہے اور اسی لیے میں نے بادلوں سے اتر کر ایک جھنڈا ہاتھ میں لے لیا جسے ہر کوئی دیکھ سکتا اور پہچان سکتا ہے، جس کے پیچھے کارفرما اصول واضح ہیں۔ یہ جھنڈا ٹھوس رہنمائی کا جھنڈا ہے، یہ عوامی جدوجہد کا جھنڈا ہے، ذاتی اقتدار کا جھنڈا نہیں۔"

بھٹو صاحب ذرا کی ذرا رکے اور میں نے سوال کیا — "پاکستان پیپلز پارٹی کو قائم ہوئے اور آپ کو یہ جھنڈا اٹھائے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ آپ کے خیال میں آپ کو کس حد تک کامیابی ہوئی ہے؟"

بھٹو صاحب نے نیا سگار سلگایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگے — "پاکستان پیپلز پارٹی نے شدید مشکلات کے باوجود اس ایک سال میں ناقابل یقین حد تک ترقی کی ہے۔ زمین بہت سنگلاخ تھی۔ ہمارے کام کی نوعیت یہ تھی جیسے برسوں کی پیاسی زمین کو پانی دینا ہو۔ پھر بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید دنیا بھر میں کسی پارٹی نے اتنی کم مدت میں اتنی زبردست ترقی نہیں کی جتنی ہماری پارٹی نے کی ہے۔ یہ ایک نئی پارٹی ہے، اس کا اسلوب بھی نیا ہے — مخلصانہ اور جاندار۔ اس کا سائنٹفک اور ٹھوس پروگرام عوام کے لیے اپیل رکھتا ہے۔ اس پروگرام نے عوام کو نئی امید دی ہے، نیا حوصلہ دیا ہے۔ اس پارٹی نے عوام کے مزاج اور کیفیات کو سمجھا ہے اور یہ قربانیوں کے لیے تیار ہے۔ اس کی نظر مستقبل کے آر پار جھانک رہی ہے اور یہ اقتدار کے لیے بے چین نہیں۔ اس نے ایک سال کے اندر اندر اپنی تنظیم کا کام بڑی حد تک مکمل کر لیا ہے، کارکنوں کی ایک کھیپ تیار کی ہے اور سیاسی تعلیم کے لیے لٹریچر پیدا کیا ہے۔ اس کا کردار انقلابی ہے اور یہ مسائل کی تہہ تک اترنے کی جرأت رکھتی ہے۔ اس کی قیادت کو اقتدار و اختیار کا تجربہ ہے اور وہ عوامی جدوجہد کی کٹھالی میں پڑ چکی ہے۔ اس کا پروگرام بھی انقلابی ہے۔ یہ ایک مجاہدانہ قومی پارٹی ہے جس کی باگ ڈور کسی بیرونی طاقت کے ہاتھ میں نہیں۔ یہ پارٹی عمل میں یقین رکھتی ہے۔ پاکستان کی خدمت کو شعار بنا کر یہ پارٹی صحیح روایات کی داغ بیل ڈالے گی اور یوں اپنے لیے رفیع الشان مقام پیدا کرے گی۔ جب وقت آئے گا تو ثقافتی انقلاب کی طرح یہ پارٹی ایک زبردست تحریک ابھارے گی جس سے قومی صفوں میں توانائی اور بیداری کی روح پھونکی جائے گی۔ اس تحریک کا نام ہوگا "پاک سرزمین کی پاکیزگی۔" اس تحریک کے ذریعے ہماری پارٹی ایک ہی زبردست ہلے میں بدعنوانی، رشوت ستانی، اقربانوازی، لوٹ کھسوٹ اور کام چوری کا خاتمہ کر کے معاشرے کو جدید اور ترقی پسند بنیادوں پر کھڑا کر دے گی۔ ہاں، ہم بھی قرار دادیں پاس کرتے ہیں اور بیانات جاری کرتے ہیں لیکن ہم ان باتوں کو عمل کی معراج نہیں سمجھتے۔"

بھٹو صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، ان کی آواز بلند ہو گئی، وہ کہہ رہے تھے — "پاکستان پیپلز پارٹی مستقبل کی پارٹی ہے۔ اس کے پاس مقاصد ہیں اور ان کے حصول کے لیے لگن ہے۔ وقت کے تمام تر ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جو لوگ سیاست کی جنگ میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہی راہ ہے کہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر ملک و قوم کی عظمت کے لیے ہمارے شانہ بشانہ کام کریں۔ انشاء اللہ ہم پاکستان کی عظمت کے امین ثابت ہوں گے۔"

سیاسی ڈائری — پاکستانی

مساوات کے خلاف جارحیّت

عوامی تحریک میں جُوں جُوں تندی و تیزی پیدا ہوتی جارہی ہے، دائیں بازو کے نظریات و مفادات کے رکھوالے بھی اسی تیزی سے بے نقاب ہوتے جارہے ہیں۔ اب ان میں یہ کوئی فرق نہیں رہا کہ وہ لوگ حکومت کی مشینری پر قابض ہیں یا بظاہر حزبِ مخالف میں رہ کر بھی اس شعر کے مصداق ہیں:

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

عوام اب یہ بات سمجھ گئے ہیں کہ جمہوریت کی جنگ بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں۔ یہ تو ایک راستہ ہے جس پر چل کر انھوں نے معاشرتی و معاشی مساوات کی منزل حاصل کرنی ہے اور بین الاقوامی سرمایہ داری کی بدترین صورت امریکی سامراج سے آزادی چھین لینی ہے۔ عوام نے تہیہ کرلیا ہے کہ موجودہ عوامی تحریک اپنے مقاصد کے اعتبار سے ادھوری نہیں چھوڑی جائے گی۔ اسی لیے عوام اپنے ہر مظاہرے میں جہاں آمریت کے خلاف نعرے لگاتے ہیں وہاں وہ اپنی تحریک کے مثبت پہلو کو بھی نظرانداز کرنے کو تیار نہیں ہوتے چنانچہ سوشلزم زندہ باد اور امریکی سامراج مُردہ باد کے نعرے ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فضا میں گونجنے لگتے ہیں۔ سوشلزم کی اصطلاح اس ملک کے اسلام پسند عوام نے اسلامی مساوات کے معاشی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے خوشدلی سے قبول کرلی ہے۔ سوشلزم کا جو مفہوم ہمارے عوام نے اپنایا ہے وہ کسی بھی صورت میں اسلام کا حریف نہیں بلکہ ان انسانی اقدار کو معاشی میدان میں آگے بڑھانے کی جدید اصطلاح ہے جن کی سربلندی کے لیے اسلام آیا تھا۔ اس لحاظ سے اسلام اور سوشلزم کے اس مفہوم میں کوئی چپقلش نہیں۔

اب یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ دائیں بازو کی انتہاپسند پارٹی، جماعت اسلامی اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک فسطائی جماعت ہے۔ وہ اپنے مخصوص نظریات کو اسلامی تشریحات کے نام سے عوام پر ٹھونسنا چاہتی ہے۔ اندرونِ ملک یہ جماعت جاگیرداری اور سرمایہ داری کی پشت پناہ ہے اور خارجہ معاملات میں ان ممالک کی دوست ہے جو اُن کے ملکی مفادات کی حفاظت کرسکیں۔ ہمارے ملک کا رجعت پسند طبقہ اپنی منافع بازی کو قائم رکھنے کے لیے سامراجی ممالک کا حلیف اور دوست ہے۔ اس نے بعض مجبوریوں کے تحت سوشلسٹ ممالک سے تجارت تو بڑھالی ہے لیکن اس کا دل اب بھی ان سوشلسٹ ملکوں کے خلاف نفرت اور خوف سے بھرا ہوا ہے۔ اس نفرت اور خوف کا اظہار یہ لوگ اپنی تجارتی مجبوریوں کی بنا پر حکومت کے پلیٹ فارم سے تو نہیں کرسکتے۔ لیکن یہاں پر جماعتِ اسلامی ان کی خدمت اور مدد کے لیے فوراً آن پہنچتی ہے۔ اب چونکہ دائیں بازو کے مفادات کی اس رکھوالی جماعت نے حزبِ اختلاف کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اس لیے ڈپلومیٹک رکھ رکھاؤ کو مجروح کیے بغیر سوشلسٹ ممالک کے خلاف نفرت پھیلانے کی مہم بلاجھجک جاری رہتی ہے۔ جماعت اسلامی کی بڑی بڑی توپوں نے جس گھن گرج کے ساتھ پچھلے دنوں میں پاک چین دوستی کے خلاف بیانات دیئے، کتابچے چھاپے اور باقاعدہ مہم چلائی وہ اس پس منظر میں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

موجودہ عوامی تحریک جُوں جُوں آگے بڑھتی جارہی ہے جماعت اسلامی کی بوکھلاہٹ بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا اظہار اب وہ حزبِ اختلاف کے جلسوں اور مظاہروں میں سوشلزم اور پاک چین دوستی کے خلاف نعرے لگا کر پیش کرتے ہیں۔ اب اس قسم کی خبریں ہر جگہ سے آنی شروع ہوگئی ہیں کہ جلوس کے اختتام پر جماعت اسلامی کے کارکنوں نے اسلامی سوشلزم مُردہ باد کے نعرے لگائے اور نتیجے کے طور پر پیپلز پارٹی اور نیپ کے کارکنوں سے ان کا تصادم ہوگیا۔ کراچی میں ایرمارشل اصغر خاں نے جس اجلاس کو قائداعظم کے مزار پر خطاب کرنا تھا اس میں جماعت اسلامی کے کارکنوں نے سوشلزم اور چین کے خلاف نعرے لگا کر تصادم کی وہ صورت پیدا کی کئی کارکن لاٹھیوں اور پتھروں کے آزادانہ استعمال سے زخمی ہوگئے۔

جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا مودُودی جب اپنے کامیاب اپریشن کے بعد لندن سے لاہور کے ہوائی اڈے پر اُترے تو انھوں نے سوشلزم کے خلاف ایک انتہائی جارحانہ بیان دیا جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ اس ملک میں سوشلزم ہماری لاشوں پر ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ اسلام اور سوشلزم کو یکجا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے یہ بیان پڑھ کر جان لیا تھا کہ اب فسطائیت مزید پر پُرزے نکالنے کا اعلان کررہی ہے۔ ورنہ سوشلزم جس معاشی مساوات کا سمبل ہے اور اقتصادیات میں جس انداز سے ہمارے عوام نے اسے اپنایا ہے اس کا اسلام سے کوئی ٹکراؤ نہیں۔ لیکن فسطائیت کی بنیاد ہی اس چیز پر ہے کہ نظریۂ حیات کی جو تشریح وہ خود کرے اسے بجبر عوام پر ٹھونسا جائے اور اس سے مختلف تشریح کرنے والے ہر شخص کو گردن زدنی قرار دیا جائے۔ فسطائیت صرف اپنا نظریہ ٹھونستی ہے اسے اس چیز کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ عوام کا اجتماعی ضمیر کس چیز کو قبول کرتا ہے اب یہ صورتِ حال ہماری سیاست میں پیدا کردی گئی ہے کہ جماعت اسلامی اسلام کی مخصوص تشریح لے کر میدان میں نکل آئی ہے۔ اس تشریح کے مطابق جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ذریعے بے حد و حساب دولت جمع کرنا اسلامی تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اسی واسطے سے چین دشمنی کا اعلان کرنا اور بالواسطہ امریکی سامراج کی حمایت کرنا اسلامی ضرورت بن جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات ہر عقل و خرد رکھنے والے کے نزدیک بالکل غلط ہے۔ ہم جماعت اسلامی کا یہ حق ماننے

کو تیار نہیں کہ اسلام کی جو تشریح وہ اپنے مخصوص مفادات کی حفاظت کے لیے کرتے ہیں وہی ہر ایک کو ماننی ہو گی ورنہ مخالفین کے لیے ان کے پاس لاٹھیاں اور پتھر ہیں۔ اس قوم کے دلوں میں اسلام کی محبت اس طرح بسی ہوئی ہے کہ اس کا اجتماعی ضمیر کسی خلافِ اسلام نظریہ پر کبھی بھی اجماع نہیں کرے گا۔ عوام نے اپنے حقوق کی جنگ میں اگر سوشلزم کی اصطلاح قبول کر لی ہے تو ہمیں قوم کے اجتماعی ضمیر پر پورا پورا بھروسا ہے۔ انھوں نے اسلام سے فرار اختیار کر کے ایسا نہیں کیا بلکہ اسلام کی محبت نے ہی ان سے ایسا کروایا ہے۔ دوسرے ہمارے سامنے علمائے حق کا وہ مجاہدانہ کردار بھی ہے جو انھوں نے پیپلز پارٹی اور نیپ کے کارکنوں کے ساتھ مل کر عوامی حقوق کے لیے آواز اُٹھا کر تشدد کا شکار ہو کر کیا ہے۔ جس سوشلزم زندہ باد کا نعرہ لگانے سے جماعتِ اسلامی کا تقدس داغ دار ہو جاتا ہے۔ اس سے جمعیۃ العلماء اسلام کے علماءِ حق نے تو ماتھے پر بل نہیں ڈالے۔ انھوں نے تو سامراج کے خلاف کتبے خود بھی اُٹھا رکھے تھے۔ یہ فرق کہیں اس وجہ سے تو نہیں ہے کہ علماءِ حق کا گروہ جب برطانوی سامراج سے ٹکرا کر جاں نثاری کی نئی روایات قائم کر رہا تھا تو مولانا مودودی ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھے اسلام کی ایک من مانی تشریح ایجاد کر رہے تھے۔

سوشلزم اور چین کے خلاف جماعتِ اسلامی کی نئی جارحیت ایک فسطائی عمل ہے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ عوامی تحریک کے لیے اس خطرے سے آگاہ ہونا اور اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔

ایک آواز — ایک آدرش — ایک پیغام
پاکستان کی عظیم شخصیت پر ایک عظیم کتاب
ذُوالفقار علی بھٹو
شخصیت اور کردار
ایک تاریخی دور کی تاریخی روداد ۔ قیمت ۳/۵۰

بھٹو ۔ تصاویر کے آئینے میں
چیئرمین بھٹو کی تاریخی تصاویر کا البم۔
زندگی کے ہر دور کی تصاویر۔ آرٹ پیپر پر خوبصورت نیز آفسٹ طباعت
قیمت ۲/۰۰
مکتبۂ عالیہ ۔ ایبک روڈ ۔ لاہور

چینی مطبوعات
کتابیں

۱۔ ماؤزے تُنگ کے سیلکٹڈ ورکس (چار جلدیں)، مکمل سیٹ	تیرہ روپے
۲۔ ماؤزے تُنگ کی سیلکٹڈ ریڈنگز	تین روپے
۳۔ ماؤزے تُنگ کی ملٹری رائٹنگز (پلاسٹک کور)	دو روپے

رسالے

۱۔ پیکنگ ریویو	(ہفت روزہ)	۳۰ پیسے
۲۔ چائنا پکٹوریل	(ماہ نامہ)	۴۰ پیسے
۳۔ چین بالتصویر	(ماہ نامہ)	۴۰ پیسے
۴۔ چائنا ری کنسٹرکٹس	(ماہ نامہ)	۴۰ پیسے
۵۔ چائنا میڈیسن	(ماہ نامہ)	ڈیڑھ روپیہ

تفصیلات کے لیے لکھیے
کلاسیک ۔ ۴۲ دی مال (شاہراہ قائداعظم) لاہور ۳

ویت نام میں جنگی جرائم
تصنیف: برٹرینڈ رسل
ترجمہ: مبارک حیدر
دیباچہ: میاں محمود علی قصوری

- ویت نام میں جنگ کے خلاف دنیا کے عظیم فلسفی اور دانشور برٹرینڈ رسل کی آواز
- ان مظالم کی مبسوط فہرست جو ویت نامیوں پر ڈھائے جا رہے ہیں۔
- ویت نامیوں کو ان مظالم سے بچانے کے لیے چند تجاویز

نگارشات
۱۷۶، انارکلی، لاہور

ملک معراج خالد ایم پی اے

ضمیر کا بحران

وہ قرارداد جو مغربی پاکستان مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں پیش نہ ہونے دی گئی

مغربی پاکستان اسمبلی کا یہ اجلاس ملک بھر میں ادیبوں، صحافیوں، وکیلوں، طالب علموں، محنت کشوں، علمائے کرام اور تمام سیاسی جماعتوں کی زیرِ قیادت عوامی مظاہروں سے پیدا شدہ صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے بعد قرار دیتا ہے کہ وسیع تر قومی مفاد اور ملّی استحکام کے پیشِ نظر خود احتسابی اور خود نگری کا فرض ادا کیا جائے اور ان اسباب و علل کی بلا کم و کاست نشاندہی کی جائے جن کی وجہ سے مختلف معاشی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوتے اور عوام کی ایک عظیم محبِّ وطن اکثریت حکومت کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ یہ اجلاس اپنا سیاسی اور اخلاقی فرض سمجھتا ہے کہ اصلاحِ احوال کی خاطر وہ ملکی اور قومی مفاد کو ذاتی اور گروہی مصلحت پر ترجیح دے اور عوامی احساسات کا احترام کرتے ہوئے اپنی تجاویز پوری دیانت داری اور ذمہ داری سے قیادت کے سامنے پیش کرے۔ اس اجلاس کی رائے میں تحریکِ پاکستان کے تاریخی عوامل کا معروضی مطالعہ وہ ناگزیر معیار مہیا کرتا ہے جس کی روشنی میں ہی مسائل کا صحیح تجزیہ ممکن ہے اور موجودہ عوارض کے علاج کے لیے کوئی مثبت، جامع اور دائمی لائحہ عمل مرتب کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اجلاس کی رائے میں مسائل کا تجزیہ یہ ہے:۔

۱۔ ہندوستان میں صدیوں تک مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ان کی مضبوط مرکزیت یعنی ان کی معاشرتی وحدت اور ملّی یک جہتی کا مرہونِ منت تھا۔ لیکن جونہی چند سلاطین اور ان کے ہم مسلک طبقۂ امراء نے اسلامی عقیدہ و عمل سے انحراف کی راہ اختیار کی تو مکافاتِ عمل کا فطری قانون حرکت میں آگیا اور ان کی ذلّت و رسوائی کے اسباب پیدا ہوگئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے صلحائے ملّت نے زوال کی علتوں کو پہچانا اور عدل و مساوات کی اسلامی قدروں کو مسلمانوں کی سیاسی قوت اور تہذیبی بالادستی کی بنیاد بنانے کی مساعیٔ جہاد کو تیز تر کردیا۔ مدّت ہائے دراز تک حق کے پرستاران معاشی ناہمواریوں، معاشرتی بے انصافیوں اور تہذیبی کجرویوں کو دُور کرنے کی فکری اور عملی جدوجہد کرتے رہے جو اسلامی اصولِ زندگی سے روگردانی کی بنا پر مسلمان معاشرے کو لاحق ہو رہی تھیں۔ جہاں مسلمان عوام نے حق و صداقت کے مجاہدوں کی پذیرائی کی اور معاشرتی مرکزیت کو مضبوط بنانے میں ان کی ہمنوائی کی، وہاں برسرِاقتدار امراء کا طبقہ اپنی زر پرستی، استحصال پسندی اور عیش کوشی کی روش کو ترک کرنے پر مائل نہ ہوا اور عدل و مساوات کے تقاضوں کو پاؤں تلے روندنے پر تُلا رہا اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے ہر احتسابی آواز کو بے دریغ کچلتا رہا۔ نتیجے کے طور پر حصولِ اقتدار کی کشمکش نے سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو جنم دیا اور تمام معاشرے کو انتشار اور خلفشار میں مبتلا کردیا۔ غیر اسلامی عصبیتیں پروان چڑھیں۔ مرکزیت کمزور پڑگئی۔ مسلمانوں کا اتحاد اور استحکام ناپید ہوگیا۔ لُوٹ کھسوٹ کا دَور دورہ ہوگیا اور معاشرتی قدریں یکسر اُلٹ گئیں۔ جس کے بعد غیر ملکی حملہ آوروں کو مسلمانوں کو سیاسی طور پر مغلوب اور معاشی لحاظ سے خوار و زبوں بنانے کی راہ میں کسی دشواری اور مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

۲۔ ۱۸۵۷ء کے انقلابِ آزادی میں مسلمانوں کی ہزیمت نے جہاں فرنگی سامراج کو مسلمانوں کی محرومی اور بے چارگی کو انتہا تک پہنچانے کے قابل بنایا، وہاں اس ابتلا نے اصحابِ فکر و عمل کو ایک صدی سے جاری رشد و ہدایت کے سلسلے کو تیز تر کرنے کی جرأت اور عزم و ارادہ عطا کیا۔ مرورِ ایام کے ساتھ ان کا نظریاتی اور عملی جہاد تیز تر ہوتا گیا اور جُوں جُوں گراں باریاں بڑھتی رہیں، ان کی حُدی خوانی کے سوز و درد اور انقلابی ولولہ انگیزی میں شدّت پیدا ہوتی گئی۔ تاآنکہ اقبال نے باطل کے خلاف مسلمانوں کے اس طویل جہادِ آزادی کو اپنے حیات آفریں پیغام میں سمویا اور انھیں اعتقادی وحدت سے سرشار کرکے آمادۂ پیکار کیا۔ اس کی حجازی لَے نے ان کے فکر و نظر میں یک رنگی پیدا کی اور انھیں اس کے آئینۂ فکر میں اپنی نجات کی صورت نظر آئی۔ اقبال کا فکر تحریکِ پاکستان کی نظریاتی بنیاد بنا اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم آدابِ خود آگاہی سے روشناس ہوا اور ان میں جانفروشی اور جاں بازی کے باطل سوز ولولے جاگ اُٹھے تو قائدِ اعظم نے اپنی حریت پرستی، جرأت، فراست اور پامردی و تدبّر سے انھیں ایک منظم، متحد، جمہوری اور عوامی مرکزیت کی ناقابلِ شکست قوّت میں تبدیل کردیا اور انگریزی اور برہمنی سامراج کی متحدہ جابر اور قاہر قوتوں کو شکستِ فاش دی اور اس طرح ایک پیامبرِ فکر اور ایک مردِ دانا و جری کے طفیل ہمارا جہادِ آزادی فتح و نصرت سے ہمکنار ہوا۔

۳۔ پاکستان جس نظریۂ زندگی کی بدولت وجود میں آیا منطقی طور پر وہی اس کی بقا، سالمیت اور ترقی کا واحد ضامن تھا اور ہم اس سے سرِمُو بھی انحراف کرنے کے مجاز نہیں تھے۔ اس لحاظ سے ناگزیر طور پر لازم آتا

تھا کہ اسلام کا عدلِ عمرانی پاکستان کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام کی بنیاد بنتا اور عوام کو ہر استحصال، دباؤ اور تحریص سے آزاد کر کے اقتصادی جمہوریت کا قیام عمل میں لایا جاتا۔ انسانی آزادی، مساوات اور اخوت کی آفاقی قدروں کو مملکت کی اندرونی و بیرونی حکمت عملیوں کا مرکز و محور بنایا جاتا۔ لیکن چونکہ اس بنیادی نظریے سے انحراف کیا گیا اور قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ان کے واضح فرمودات کے برعکس عوام کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر دولت و حکومت پر قابض ایک قلیل گروہ کے معاشی و سیاسی مفادات کے تحفظ اور پاسداری کی روش اختیار کی گئی اور عوام کی آزادانہ مرضی و رضامندی کے خلاف ایسی معاشی اور معاشرتی پالیسیاں وضع اور نافذ کی گئیں جن سے معاشی ناہمواریوں، سیاسی جکڑ بندیوں اور معاشرتی بے انصافیوں کا پیدا ہونا لازمی امر تھا اور برادری پرستی، لسانی اور علاقائی تعصبات ایسے مرکز گریز اور قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے رجحانات کا پروان چڑھنا بدیہی بات تھی اور اس لیے قیادت کا عوام کے شعوری تعاون و حمایت سے محروم ہونا ان تضادات کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ چنانچہ عوام کا قیادت پر اعتماد اُٹھ گیا۔ عوام کی تنظیم کی اصولی سیاسی بنیادیں منہدم ہو گئیں اور عوامی اتحاد کے رشتے کمزور پڑنے سے مرکزیت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ معاشی نظام کے استحصالی ہونے کی وجہ سے پارلیمانی نظامِ سیاست جمہوری تقاضوں کو پورا نہ کر سکا اور قیادت اور عوام کے درمیان اشتراک و تعاون کے تمام رشتے کٹ گئے اور مسلم لیگ جو عوام کی آزادی، جمہوری حقوق اور معاشی استحصال سے نجات کا روشن نشان اور موثر ذریعہ تھی۔ انہی مفادات کی بدولت سیاسی طالع آزماؤں کا آلۂ کار بن گئی۔ سامراج نے ان حالات سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا اور اس کی پسند و ناپسند مملکت کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں کا مدار بن گئی۔ عقیدہ و عمل کے ان تضادات نے عوام کو حکومت کے خلاف اس حد تک بیزار بلکہ بغاوت پر آمادہ کر دیا کہ اس خلفشار کے تدارک کے لیے اکتوبر ۱۹۵۸ء کا فوجی انقلاب لازمی مداوا سمجھا گیا۔

۴ - انقلاب کے فوجی قائدین نے بھی حالات کی ابتری کا سبب نظریۂ پاکستان سے روگردانی قرار دیا اور ردِ عمل کے طور پر اس عہد کا اعلان کیا کہ وہ اس کی بازیابی کے لیے معاشرے کی تعمیرِ نو اسلامی عدل و مساوات پر استوار کریں گے اور عوام کو ہر استحصال اور جبر سے نجات دلا کر ان کی حکمرانی کا حق بحال کریں گے۔ انھوں نے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق مختلف شعبوں میں اصلاحات کا نفاذ بھی کیا اور سرے سے اپنی اس نظریاتی روش کا ثبوت مہیا کر دیا کہ عوام ہر سیاسی شعور اور معاشرتی احساس سے عاری ہیں جس کی رُو سے ان کی رائے حکومت کے فیصلوں کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ ظاہر ہے کہ باوجود انتہائی خلوصِ جذبہ کے ان کا ذہن کسی ایسے سیاسی نظام کو قبول نہیں کر سکتا تھا جو جمہور کی سلطانی اور عوام کی حکمرانی کی ضمانت دیتا۔ چنانچہ انھوں نے سابقہ معاشی نظام کو قائم رکھا بلکہ اس کی اجارہ دارانہ خصوصیات کو محکم تر بنانے کے موثر اور مثبت اقدامات کیے جس سے دولت اور دولت آفریں وسائل صرف ایک قلیل گروہ کی ملکیت بنتے اور امارت اور غربت کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں، عوام کا معاشی [illegible] ہو جاتا ہے اور معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کی اسلامی قدریں ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابی حکومت کے اصلاحی اقدامات بھی تضادات کا شکار ہو گئے اور بیرونی سرمایہ سے مادی ترقی کی برکات اکثر و بیشتر چند خاندانوں کا مقدر بن کر رہ گئیں۔ یہی وجہ ہے آج رشوت ستانی، مفاد پرستی، چور بازاری، کنبہ پروری اور ذاتی مفاد پرستی کا لامتناہی مکروہ سلسلہ دراز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ارتکازِ دولت کے عمل نے اخلاقی قدروں کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ نوکر شاہی عوام پر جبر اور ان کے استحصال کے لیے اربابِ اختیار کی آلۂ کار ہی نہیں براہِ راست اتحادی بن گئی ہے۔ عوام کی فکری یک رنگی اور عملی اتحاد کی تمام معاشی اور معاشرتی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے مرکز گریز رجحانات کو پھر سے پرورش پانے کا موقع ملا ہے اور ۱۹۵۸ء سے قبل کی داستان دہرائی جا رہی ہے۔

۵ - اس استحصالی نظام کو تمام و کمال مسلط اور مستحکم کرنے کے لیے ایسے سیاسی اقدامات کیے گئے ہیں جو منطقی طور پر ناگزیر تھے۔ سیاسی نظام کی تنظیم لامحالہ معاشی نظام کے تابع ہوتی ہے اور چونکہ انقلابی قیادت نے موجودہ اجارہ دارانہ نظام کو تقدیس کا درجہ دیا ہے اور تحریکِ پاکستان کا تاریخی عمل عوامی اتحاد کے ذریعے جس مرکزیت کا متقاضی تھا اس کے جمہوری تقاضوں کے علی الرغم عوام کے استحصال اور ان پر جبر و استبداد کے ذریعے مرکز کی مضبوطی کے نظریے کو جزوِ ایمان بنایا گیا۔ اس لیے موجودہ سیاسی نظام اپنی استحصالی غیر جمہوری اور غیر عوامی نوعیت و خاصیت میں نافذ العمل معاشی نظام سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔ انقلابی قائدین کی طرف سے اپنے عہد سے انحراف کے نتائج اب کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کا دستور جو اس سیاسی نظام کے بنیادی خد و خال اور جزئیات کا امین ہے۔ انہی استحصالی خصوصیات کو جاگزیں اور محفوظ کرنے کے لیے مرتب کرنا پڑا۔ اس آئین کی رُو سے جس کی ترتیب و تشکیل میں عوامی رائے اور مشورے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ صدر، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کا انتخاب براہِ راست

بالغ رائے دہی کی بجائے بنیادی جمہوریت کے بالواسطہ طریقے سے لازمی قرار دیا گیا۔ مارشل لاء کے دوران عوام کا اقتصادی استحصال اور ان پر سیاسی جبر کرنے والے اقدامات کو جمہوری جرح و تنقید سے ماوراء گردانا گیا۔ شہری آزادیاں سلب کرنے کے لیے انتظامیہ کی عدلیہ پر بالادستی کی ضمانت مہیا کی گئی۔ صدر کی ذات کو تمام اختیار و اقتدار کا مرکز بنا دیا گیا۔ مجالسِ قانون ساز کو بے اختیار اداروں کی حیثیت دے دی گئی۔ وزراء کو عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دہ ہونے کی بجائے صدر کے نامزد کردہ گورنر کی پسند و ناپسند کا محتاج بنایا گیا اور اراکینِ اسمبلی کو بیوروکریسی کے مقابلے میں اس حد تک غیر محفوظ اور بے حیثیت رکھا گیا کہ وہ موخر الذکر کی طرف سے ان کے ساتھ ہر ذلت آمیز سلوک کو برداشت کرنے پر مجبور ہوں اور عوام کی خواہشات اور مطالبات حکومت کے سامنے پیش کرنے کا لازمی فریضہ بھی ادا نہ کر سکیں۔

طرزِ حکومت پارلیمانی ہو یا صدارتی صرف اسی صورت میں عوام کی حاکمیت کا دعویٰ کر سکتا ہے اگر اکثریت کی آزادانہ رائے اور ان کی شعوری حمایت و تعاون حکومت کی ہر پالیسی اور اقدام کی بنیاد ہو۔ لیکن جب ایسے معاشی نظام میں دولت اور دولت آفریں وسائل چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جائیں اور سیاسی اختیار و اقتدار ایک ذات میں مرکوز کر دیے جائیں اور عوامی جمہوریت کی بجائے اسے ہی مرکز کی مضبوطی قرار دیا جائے تو بے انصافی، حق تلفی، نفس پرستی اور عوام دشمنی کا فروغ پانا لازمی ہے اور ان برائیوں کے خلاف عوامی احتجاج اور جمہوری احتساب کی ہر کوشش اور خواہش کو دبانا اور جبر و تشدد کے تمام حربے استعمال کرنے جائز اور ضروری سمجھ لیے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسانوں، مزدوروں، محنت کشوں، چھوٹے تاجروں اور صنعت کاروں اور چھوٹے ملازموں کی صدائے احتجاج کو دبانے کے لیے ہر متشددانہ اقدام کو روا رکھا گیا ہے اور تحریر و تقریر پر پابندیاں، پریس پر ناروا کنٹرول، اجتماع کی ممانعت، مزدوروں کے اجتماعی سودے بازی کے حق کی تنسیخ، طلباء و اساتذہ کے فکر و علم کی اسیری اور ہنگامی قوانین کا نفاذ کر کے جمہوری قدروں کی تکذیب و تحقیر کے سامان فراہم کیے گئے ہیں۔ اور اس طرح عوام کو ان کے سیاسی اور جمہوری حقوق سے صریح طور پر محروم کیا گیا ہے سیاسی جماعتوں کو اپنے اپنے سیاسی پروگرام عوام کے سامنے پیش کرنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر کے قوم میں نظریاتی یک جہتی اور عملی وحدت کے مقصدِ عزیز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا گیا ہے۔ خود حکمران سیاسی پارٹی یعنی پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم اور اس کے طریقِ کار کو عوامی احتساب سے بچنے کے اصول پر وضع کیا گیا ہے۔ جس سے ہر سطح پر اس کی قیادت کا انتخاب عوامی تائید کی بجائے دولت کے غیر عوامی معیار پر عمل میں آیا ہے اور اس کی صوبائی اور مرکزی قیادتیں نچلے درجے کے کارکنوں کی جماعتی رائے کو اپنے سیاسی فیصلوں کا مدار بنانے کی بجائے ذاتی فیصلے کو مقدم جانتی ہیں اور معروف جمہوری آداب اور تقاضوں کو نظر انداز کر کے سیاسی فکر و نظر کے فروغ و ارتقاء کو روک رہی ہیں اور نتیجے کے طور پر سیاسی جماعت کے ذریعے اپنے فلسفہ و پروگرام کے لیے عوام کا تعاون حاصل کرنے کی بنیادی سیاسی ضرورت سے دانستہ چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ مسلم لیگ اور قائدِ اعلیٰ کی ذات لازم و ملزوم بن کر رہ گئی ہیں اور قوم کو متبادل قیادت کے ذریعے جس سیاسی تسلسل اور پرامن ذرائع سے سیاسی تبدیلی کی ضرورت ہے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں دانستہ پہلو تہی کی جا رہی ہے۔ سیاسی کارکن اور جماعت سے وابستہ افراد بے کسی، بے حسی اور عوام سے لاتعلقی کے یاس انگیز احساس میں مبتلا ہو چکے ہیں اور چاپلوسی اور خوشامد ہی حصولِ مقاصد کا ذریعہ بن گئی ہے۔ یقینی طور پر سیاسی جماعت کے ذریعے عوام میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کرنے سے گریز کی یہ پالیسی قومی استحکام نہیں عدمِ استحکام ہی کا باعث ہو سکتی ہے اور عوام سے کٹ کر مرکز کی مضبوطی کا ارفع مقصد حاصل کرنا ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ کا غیر متبدل فتویٰ یہی ہے کہ اسلامی قدروں کے مطابق جمہور کی سلطانی ہی مضبوط مرکز کا دوسرا نام ہے۔

یہ اجلاس یکسر پاکستانی قوم کی متفقہ رائے اور عزمِ صمیم کی ترجمانی کرتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ پاکستان کی موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ اصولی طور پر اور سیاسی ضرورت کے تحت بھی ہم پر لازم آتا تھا کہ ہم پاکستان کے نظریاتی وجود کو اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل کی بنیاد بناتے اور پاکستان میں عوامی جمہوریت کی برکات اس طرح جاری و ساری کرتے کہ کشمیری عوام پاکستان کو اپنی امیدوں کا واحد مرکز قرار دیتے یا کم از کم ہم آزاد کشمیر میں جمہوریت، مساوات اور اسلامی عدل و انصاف کی حکمرانی اور بالادستی کا ایسا نقشہ مرتب کرتے کہ کشمیر کے اندر اور باہر پاکستان دشمن عناصر کی مکروہ چالیں کشمیریوں کے جہادِ آزادی کو کوئی گزند نہ پہنچا سکتیں۔ لیکن اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ ہماری زندگی کے معاشی اور سیاسی تضادات نے آزاد کشمیر کے معاشی اور سیاسی نظام کو بھی اپنی آلودگیوں سے ملوث کر رکھا ہے اور اسلام کے نام پر وہاں زندگی کو سنوارنے اور منضبط کرنے کی جو اسلام گریز صورتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں ان سے پاکستان اور کشمیر کے درمیان اس واحد اور مضبوط ترین رشتے کی کمزوری واقع ہونے کا ہر احتمال پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر آزاد کشمیر کی بارہ ارکان کی کونسل میں چار ارکان کی نامزدگی کو روا رکھ کر جمہوریت اور عوام کے حقِ حکمرانی کی جس طرح مٹی پلید کی گئی ہے اور اسلامی انصاف پسندی کے تقاضوں کو جس انداز سے مجروح کیا گیا ہے اس سے ہم کشمیری حریت پرستوں اور آزادی و انصاف کے طلب گاروں سے کسی داد و تحسین اور تشکر و امتنان کی تمنا نہیں کر سکتے اور جہادِ کشمیر کے لیے کشمیریوں کو مسلح جدوجہد کا جو اٹل مرحلہ درپیش ہے پاکستان

اور آزاد کشمیر میں غیر عوامی، غیر جمہوری اور نظریۂ پاکستان کے منافی نظامِ سیاست و معیشت کے ہوتے ہوئے اسے عبور کرنا تو کجا اس کے ابتدائی تقاضوں کو بھی پورا نہیں کر سکتے۔

مسائل کے اس تجزیے کی روشنی میں اصلاحِ احوال کی خاطر یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ موجودہ معاشی اور سیاسی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کیا جائے۔ اس لیے یہ اجلاس قرار دیتا ہے کہ:-

۱۔ سیاسی نظام کو غیر جمہوری، غیر عوامی اور متشددانہ خصوصیات سے پاک کرنے کے لیے معاشی نظام کو بنیادی طور پر اس طرح تبدیل کیا جائے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں اجارہ داریوں کا وجود کلی طور پر ناپید ہو جائے۔ معاشی جبر و استحصال اور ارتکازِ دولت کی بدولت پیدا ہونے والی اقتصادی آمریت کی تمام صورتیں ختم کی جائیں۔ دولت اور دولت آفریں وسائل کی منصفانہ تقسیم اس طرح عمل میں لائی جائے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو مکمل معاشی و معاشرتی تحفظ حاصل ہو جائے۔ حصولِ مقصد کے لیے بنیادی صنعتوں، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لیا جائے اور دوسرے شعبوں میں بھی تمام ذرائع سے حاصل ہونے والی شخصی آمدنی کا اس طرح تعین کیا جائے کہ کوئی فرد دوسرے کا معاشی استحصال نہ کر سکے اور اس طرح معاشرتی اونچ نیچ کی اقتصادی بنیاد کو ہی ڈھا دینے کا اہتمام کیا جائے۔ قومی خود کفالتی کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی سرمایہ اور مشروط قرضوں کے اثرات کو ختم کیا جائے اور قومی وسائل، مادی و انسانی پر زیادہ سے زیادہ انحصار کیا جائے۔ ہر قسم کے سامانِ تعیش و آرائش کی درآمدات بند کی جائیں۔

۲۔ صنعتی مزدوروں، محنت کشوں، چھوٹے ملازموں، چھوٹے تاجروں، صنعت کاروں کو روزگار کی ضمانت دی جائے اور ان کی آمدنی اس معیار تک لائی جائے کہ طبقوں کے درمیان معاشی دوریاں ختم ہو جائیں۔ مزدوروں کو ہڑتال کا حق دیا جائے۔ سرکاری اور مل مالکان کے اثر و دباؤ سے آزاد ان کا انجمن سازی کا حق بحال کیا جائے اور انھیں تعلیمی، طبی اور رہائشی سہولتیں دی جائیں۔ مزدوروں کو ملوں کی انتظامیہ میں شریک کیا جائے اور منافع میں معقول حصے کا حقدار قرار دیا جائے۔

۳۔ موجودہ فرسودہ جاگیرداری زرعی نظام کی اس حد تک اصلاح کی جائے کہ کاشت کاری پر بسر اوقات کرنے والے لوگوں یعنی چھوٹے مالکوں، مزارعوں اور کھیت مزدوروں کو لوٹ کھسوٹ سے نجات ملے۔ سرکاری اراضی کسانوں میں تقسیم کی جائے اور انقلابی قیادت کی زرعی اصلاحات کی سپرٹ کے خلاف معقول ذرائع معاش رکھنے والے لوگوں میں تقسیمِ اراضی کی پالیسی پر نظرِ ثانی کی جائے۔ نیلامِ اراضی کو بند کیا جائے۔ زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے بیرونی قرضوں کے ذریعے زرعی مشینری، پُرزے اور کیمیات وغیرہ کے حصول اور استعمال سے زرعی خود کفالتی کا مقصد فوت ہوتا ہے، اس سے صرف چند خوش قسمت درآمد کنندگان اور ان کے ایجنٹوں کے مفاد کو تقویت ملتی ہے۔ اس لیے اندرونِ ملک زرعی مشینری تیار کرنے کی تدابیر بروئے کار لائی جائیں تاکہ نہ زرِ مبادلہ کا ضیاع ہو اور نہ غیر ضروری مشینری کا استعمال دیہی بے روزگاروں کی تعداد میں اضافے کا موجب بنے۔ بہرحال کسانوں کے وسائلِ محنت کو مادی ذرائع پر فوقیت دی جائے۔

۴۔ تجارت میں چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری کو ختم کرنے کے لیے درآمد برآمد کو زیادہ سے زیادہ سرکاری شعبے میں رکھا جائے۔ اجناسِ خوردنی کی تجارت کو مکمل طور پر سرکاری کنٹرول میں لیا جائے۔

۵۔ رشوت ستانی اور مفاد پرستی کو موجودہ حالات میں بھی بند کرنے اور ارزاں، فوری اور فراواں دولت کمانے کی بے تحاشا دوڑ میں کمی کرنے کے لیے چند فوری اقدامات کیے جائیں اور عوام کا اعتماد و یقین بحال کرنے کے لیے ابتدا میں ایک مثالی قدم اٹھایا جائے۔ یعنی ۱۹۵۸ء کے بعد برسرِ اقتدار آنے والے سیاست دانوں کی جائدادوں کا حساب لیا جائے، جو انھوں نے اور ان کے لواحقین نے اس دوران میں صنعت و تجارت میں حصوں، سرکاری اراضی کی گرانٹوں اور الاٹمنٹوں، روٹ پرمٹوں اور لائسنسوں وغیرہ کے ذریعے بنائیں۔ یہ محاسبہ کسی جج ہائی کورٹ کی صدارت میں اعلیٰ اختیارات کے حامل ٹربیونل سے کرایا جائے جس کے دوسرے ارکان اسمبلی اور سیاسی جماعتوں سے لیے جائیں۔ اسی طرح اعلیٰ سرکاری ملازمین کی جائدادوں کا بھی محاسبہ عوامی نمائندوں پر مشتمل ٹربیونل سے کرایا جائے۔ ان احتسابی اداروں کو ناجائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی جائدادیں ضبط کرنے کا اختیار ہو۔ اقتدارِ اعلیٰ کو احتساب کے سپرد کرنے کا یہ جرأت مندانہ عمل ہوسِ زرگری اور نفع اندوزی کی لعنتوں کا سدِباب کرنے میں نہایت مؤثر ثابت ہوگا اور عوام کی لوٹ کھسوٹ اور اخلاقی بے راہ روی میں معتدبہ کمی آ جائے گی ورنہ اگر اقتدارِ اعلیٰ کی سیرت و کردار ہر حرص و آز سے پاک اور بے داغ نہ سمجھا جائے اور ان کی تردامنی کے قصے اور کہانیاں زبانِ زدِ خاص و عام ہو جائیں تو سرکاری عہدیداران اور عوام کو انصاف پسندی، سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ اقتدارِ اعلیٰ اگر بے نفسی کا نمونہ پیش کرے، عام معیار

زندگی اختیار کرے، اپنی عام بنیادی ضروریات سے زائد تمام وسائل معاشرہ کے سپرد کر دے اور اسی کو معیار عدل بنائے تو معاشی بے انصافی کے تمام سرچشمے قلیل عرصے میں بند کیے جا سکتے ہیں ۔

۶ - امیر و مقتدر افراد کی خیرات اور امداد پر معاشرتی بہبود کی منصوبہ بندی انسانی عزّ و شرف کے اسلامی تصوّر کے منافی ہے ۔ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ معاشی ناہمواریوں کی موجودگی میں رفاہی اقدامات معاشرتی مسائل کا حل نہیں ہو سکتے ۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم ہی اس کی واحد ضمانت ہے کہ یہ مسائل پیدا ہی نہ ہوں اور فلاح معاشرہ کے صحیح اسلامی تصورات ہماری اجتماعی مساعی کی بنیاد بنائے جائیں ۔

اگر معاشی انصاف کے مذکورہ بالا مقاصد اور لائحہ عمل کو نظریہ پاکستان کے لازمی تقاضے تسلیم کر لیا جائے اور اس حقیقت کو قبول کر لیا جائے کہ عوامی جمہوریت کے یہی اساسی اصول مرکزیت کی صحیح مضبوطی کے ضامن ہو سکتے ہیں تو ان کی روشنی میں سیاسی نظام کو عوامی اور جمہوری خصوصیات کا حامل بنانا ناگزیر ہو جاتا ہے اور انہی کی روشنی میں موجودہ نظام کے نقائص اور خامیوں کی بھی نشاندہی آسانی سے کی جا سکتی ہے اور ان کو دور کرنے کی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں ۔ چنانچہ ضروری ہے کہ :-

۱ - آئین کو ایسی خامیوں سے پاک کیا جائے جن سے عوام کی حکمرانی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور سیاسی شعور اور معاشرتی احساس سے عاری قرار دے کر ان کو جمہوری حقوق سے محروم کیا جاتا ہے ۔ قومی اور صوبائی بجٹوں کو عوامی نمائندوں کی منظوری یا نامنظوری کے تابع بنانا اس سمت میں پہلا قدم ہے ۔

۲ - ارکان اسمبلی اور خود صدر کے انتخاب کے لیے بنیادی جمہوریت کو انتخابی ادارہ بنانے کی بجائے براہِ راست بالغ رائے دہی کو بنیاد بنایا جائے اور ووٹ کی آزادی کی پوری پوری ضمانت دی جائے ۔ دھن، دھونس، دھاندلی کی لعنتوں کا سدباب کیا جائے ۔ انتظامیہ کو کسی سیاسی پارٹی کا ہرگز ہرگز رفیق بننے نہ دیا جائے ۔

۳ - نسلی، قبائلی، لسانی اور علاقائی تعصّبات کو ختم کرنے کے لیے انتخابات معاشی اور سیاسی پروگراموں پر لڑے جائیں ۔ سیاسی پارٹیوں کو اپنا اپنا پروگرام عوام کے سامنے پیش کرنے کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو دور ہی نہ کیا جائے بلکہ انہیں وہی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں جو حکومتی پارٹی کو نشر و اشاعت اور نقل و حرکت کے سلسلے میں حاصل ہوں ۔ تحریر و تقریر اور اجتماع کی مکمل آزادی ہو ۔ اظہارِ رائے کی آزادی کو مسدود کرنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ کا بے محابا استعمال جمہوریت کشی پر محمول کیا جائے ۔ ہنگامی قوانین منسوخ کیے جائیں اور سیاسی کارکنوں کو نظربند اور مقید کرنے اور انہیں متشدّدانہ قوانین کے ذریعے قابلِ تعزیر ٹھہرانے کی آمرانہ روش کو یکسر ختم کر دیا جائے ۔

۴ - بنیادی حقوق بحال کیے جائیں ۔ عوام کے قانونی حقوق کی حفاظت کے لیے عدلیہ کو انتظامیہ پر بہرحال فوقیت دی جائے ۔ آئین کی دفعہ ۹۸ میں مجوّزہ ترامیم کرنے سے احتراز کیا جائے ۔

۵ - آئین سازی کا کلی اختیار مجلسِ قانون ساز کو حاصل ہو ۔ یہ مجالس صدر یا گورنر کے جاری کردہ آرڈی نینس کو منظور یا نامنظور کرنے کی مجاز ہوں ۔

۶ - گورنر کی حیثیت محض آئینی ہو ۔ اس کے مقرر کردہ وزراء اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے تابع ہوں ۔ بصورتِ دیگر علیحدہ کیے جائیں ۔ خود گورنر کی تقرری متعلقہ صوبے کے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے اعتماد کے ووٹ کے تابع ہو ۔

۷ - وزراء کو حکومت کے سیکرٹریوں کے مقابلے میں ہر مسئلے پر آخری فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہو اور وزراء سیکرٹریوں کی دیانت، اہلیت اور کارکردگی پر رائے زنی کے مجاز ہوں ۔ اور ان کی رائے سیکرٹریوں کی ترقی یا تنزّل کا مدار بنائی جائے ۔

۸ - ترقیاتی منصوبوں کی ترتیب کے لیے اسمبلی کی کمیٹیاں بنائی جائیں جن کی رپورٹوں کی روشنی میں منصوبہ بندی کی جائے ۔

۹ - وزراء کی بجائے پارٹی کے ارکان سرکاری بلوں کو ایوان میں پیش کریں ۔ پرائیویٹ ممبروں کے بل سرکاری بلوں کی طرح پیش کرنے کی اجازت ہو ۔

۱۰ - ممبروں کو عوام کے نمائندے ہونے کی بنا پر عزّت و احترام کی وہی مراعات دی جائیں جو جمہوری ممالک میں مسلّمہ حقوق کی صورت میں نافذ العمل ہیں ۔ انتظامیہ پر عوامی کنٹرول جمہوریت کا اہم تقاضا ہے ۔ دفتر شاہی کی عوامی نمائندوں کے مقابلے پر بالادستی ختم کی جائے ۔

۱۱ - قومی اور صوبائی اسمبلیاں اپنے اپنے دائرۂ کار میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی طرز پر ارکانِ اسمبلی پر مشتمل ایسے مستقل کمیشن قائم کرنے کی مجاز ہوں، جو انتظامیہ کے تمام ایسے فیصلوں اور اقدامات کو کالعدم کرنے کا اختیار رکھتے ہوں جو قواعد و ضوابط کے خلاف انتظامیہ کی طرف سے کیے جائیں ۔

۱۲ - بنیادی جمہوریت کو مقامی قیادت کے ذریعے صرف مقامی معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے اور مقامی معاملات کا انتظام کرنے کے لیے وقف رکھا جائے ۔

۱۳ - صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے ارکان کی تعداد کم از کم تین تین سو مقرر کی جائے ۔ تاکہ عوامی نمائندگی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنایا جا سکے ۔ آئین میں مذکورہ ترامیم کر کے اس پر عوام کی مہرِ تصدیق لگوانے کے لیے جلد از جلد عام آزادانہ استصوابِ رائے کرایا جائے ۔

مسئلہ کشمیر کا حل اور خارجی تعلقات کی نظریاتی بنیاد

مسئلہ کشمیر کا حل پاکستان کے مسائل کے حل سے بلاواسطہ اور براہِ راست وابستہ

ہے۔ پاکستان میں عوام کی حاکمیت اور اقتصادی جمہوریت کا قیام ہی اہلِ کشمیر کو ایسا انقلابی اور عوامی پروگرام دے سکتا ہے جو ایک طرف انھیں آزادی کے لیے مجاہدانہ تگ و دو کے قابل بنائے گا اور دوسری طرف جس سے ان کے پاکستان کے ساتھ اقتصادی اور تہذیبی رشتے مضبوط تر ہو جائیں گے اور پاکستانی قیادت اور کشمیری حریت پرستوں کی رفاقت اور باہمی اعتماد کی وہ صورتیں پیدا ہو جائیں گی جو بھارتی توسیع پسندی کے خلاف ان کی مسلح جدوجہد کو ہر بیرونی سہارے سے بے نیاز کر دیں گی اور یہ جان کر کہ تحریکِ پاکستان کی انتہائی غایتوں کو مکمل کرنے کے لیے انھیں ناگزیر طور پر جو عوامی جنگ لڑنی ہے اس میں پاکستان کا ہر فردِ بشر ان کے ساتھ ہے وہ ہر کنٹرول سے آزاد ہو کر اپنی عوامی طاقتوں کو منظم کریں گے۔ یہی لائحہ عمل کشمیریوں میں خود اعتمادی اور جانفروشی کا جذبہ پیدا کر سکتا ہے اور ان میں پاکستان کے ساتھ محبت و یگانگت کے لازوال فطریاتی رشتوں کو پائیداری بخش سکتا ہے۔ یقینی طور پر مسئلہ کشمیر خود کشمیریوں کے مسلح جہاد سے ہی حل ہوگا جس کے لیے پاکستان اور کشمیر میں عوامی سیاسی نظام کی قدرِ مشترک شرطِ اوّل ہے۔ ہم صرف اسی صورت میں نہ صرف بھارتی سامراج کے خلاف ویتنام کے جانبازوں اور الفتح کے مجاہدوں کے کارنامے دہرا سکتے ہیں بلکہ عالمی سامراج کے خلاف افریشیائی اور لاطینی امریکہ کی حق پرست انقلابی طاقتوں کا ساتھ دے کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پاکستان اسلام کی انقلابی قدروں کا گہوارہ ہے اور حق و انصاف اور آزادی و مساواتِ انسانی کا علمبردار ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے پاکستان عالمِ اسلام کی آنکھوں کا تارا بن سکتا ہے اور سامراج دشمن اقوام ہمارے خلوصِ نظریہ کی بنا پر ہماری قابلِ اعتماد دوستی کا دم بھر سکتی ہیں اور کشمیریوں کو بھی دنیا بھر کی عوامی طاقتوں کا بھرپور تعاون حاصل ہو سکتا ہے۔ سامراج کے زیرِ اثر اقوام متحدہ اور برطانیہ کے عزائم کی حاشیہ بردار دولتِ مشترکہ پر بھروسا لایعنی ہے۔ پاکستان کے اندرونی عوامی استحکام اور کشمیریوں کی جانبازانہ مسلح جدوجہد کے سوا نہ مسئلہ کشمیر حل ہو سکتا ہے اور نہ دوسری اقوام سے ہمارے تعلقات کی بنیاد حق گوئی، آزادروی اور انصاف پسندی کے اصول پر استوار ہو سکتی ہے۔ خود کفیل معاشی نظام اور عدل و مساوات پر مبنی معاشرہ ہی پاکستان اور کشمیر کی مسلسل جدوجہد کو آزادی سے ہمکنار کر سکتا ہے اور غیروں کی سیاسی اور اقتصادی محتاجی و مجبوری سے مستقل نجات دلا سکتا ہے۔ ہمیں جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دنوں کی اس عوامی یک جائی و یکرنگی اور قومی اتحاد و تنظیم کی ضرورت ہے جو عادلانہ معاشی و سیاسی نظام کے ذریعے ہمیشہ قائم رکھی جا سکے اور ہم اس کی بدولت کشمیریوں کی عوامی جنگ میں آخری فتح تک ان کا بھرپور ساتھ دے سکیں، دوستوں کی توقعات پر پورے اتر سکیں اور سامراجی ریشہ دوانیوں کا کامیابی سے قلع قمع کر سکیں۔

آزادیٔ صحافت: صحافت کی آزادی، جمہوریت اور عوامی حاکمیت کے فروغ و استحکام میں شرطِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ صحافی قوم کی آنکھ، کان اور زبان ہیں۔ ان کے حواس کو محبوس کرنا عوام کے قومی شعور اور معاشرتی احساس کی بیداری کو روکنے کے مترادف ہے اور انھیں ایک آزاد، خوشحال، باضمیر اور جمہوری معاشرے کی تشکیل میں جو اہم کردار ادا کرنا ہے اس سے باز رکھنے کے ہم معنی ہے۔ صحافیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے اور ان کے فرائض کی آزادانہ ادائیگی کی راہ میں دیواریں حائل کرنے سے عوامی اتحاد اور مرکزیت غیرمعمولی طور پر مجروح ہوتی ہے اور یہ پالیسی صرف اسی صورت میں روا رکھی جا سکتی ہے جب عوام کے مقابلے پر مخصوص مفادات کا ہی تحفظ اور فروغ مطلوب ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ پریس پر ناروا پابندیوں کو فی الفور ختم کیا جائے۔ سرکاری اثر و دباؤ کے تحت کام کرنے والے نیشنل پریس ٹرسٹ ایسے اداروں کو توڑا جائے۔ پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کی فوری تنسیخ کا اعلان کیا جائے اور قانون کے ذریعے صحافیوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

طلبائ کے مسائل: طلباء اور اساتذہ معاشرے کی ایک جاندار، باخبر اور متحرک قوت ہیں۔ معاشی اور معاشرتی حالات سے ان کا متاثر ہونا ایک فطری امر ہے۔ تعلیم و تدریس کے معاملات میں بھی غیرجمہوری اور جابرانہ پابندیاں معاشی اور سیاسی نظام کے ناگزیر نتائج ہیں۔ تعلیمی درسگاہوں کی بندشیں جن مضمرات کی حامل ہے انھیں شرپسند عناصر کی تخریبی کارروائیاں کہہ کر زیادہ عرصے تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کی ذمہ داری اربابِ اختیار کو قبول کرنا پڑے گی۔ اساتذہ اور طلباء سیاسی مصلحت پسندی سے پاک ہوتے ہیں اور ان کی حساس فطرت، صاف ضمیر اور حق پرست ذہن زیادہ دیر تک ان تضادات سے مصالحت نہیں کر سکتا جو زندگی کے دوسرے شعبوں میں مختلف طبقے بعض مجبوریوں اور معذوریوں کی وجہ سے برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مزید براں وہ اپنے گرد و پیش کے حالات کا غیرجانبدارانہ نظر سے جائزہ لینے کے بعد اس احساس سے عاری نہیں ہو سکتے جو دوسروں کی محرومی اور تیرہ بختی ان کے دل میں پیدا کرتی ہے اور جلد ہی انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے اپنے مطالبات کو منوانے کی جدوجہد اصل وسیع تر عوامی محاذ کی تحریک سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ امیر اور غریب طلباء کو اعلیٰ و کمتر درسگاہوں میں تقسیم رکھنا اور سب کو مساوی مواقع مہیا کرنے کے دعوے کو اس طرح جھٹلانا دولت پر قابض طبقے کی طرف سے طبقاتی فاصلوں کو برقرار رکھنے پر عملی اصرار کا ثبوت ہے۔ معاشی ناہمواریوں کے ہوتے ہوئے نہ طلباء مساوات اور جمہوریت کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اساتذہ کو معاشرے میں عزت و احترام کا جائز اور صحیح مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں تعلیمی درسگاہوں اور وسائل کی کمی، ان کے رہائشی وسائل اور نصابی کتب کی نایابی، کمیابی اور گرانی، صحت مند تفریحی ضروریات کی عدم بہم رسانی، امتحانات کا ناقص انتظام، خالص غذا کی گرانی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد بے روزگاری اور اپنے معاملات کا خود انتظام کرنے میں ان کے جمہوری حقوق کی تلفی قومی زندگی سے متعلق پالیسی کا نتیجہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس گراں قدر افرادی قوت کو قوم و ملک کا بہترین سرمایہ اور اثاثہ سمجھا جائے۔ تضادات کو دور کرنے کے لیے دوررس اقدامات کیے جائیں اور نہ صرف طلباء اور اساتذہ کے مطالبات کو پورا کیا جائے بلکہ انھیں

فکری اور عملی طور پر ایسی تربیت دی جائے کہ ان کی تمام صلاحیتیں نظریۂ پاکستان کے مطابق تعمیرِ ملت کے لیے وقف کی جاسکیں اور وہ اندرونِ ملک عوام دشمن عناصر اور بیرونِ ملک پاکستان دشمن طاقتوں کو پہچانیں اور ان میں ہر دو کا مقابلہ کرنے کا جذبہ اور ہمت پیدا ہو اور ایک ذی ہوش اور تنومند طبقہ ہونے کی حیثیت میں وہ اپنے اہم فرض کو جانیں کہ انھوں نے جبر و بے انصافی کے خلاف جدوجہد میں ہراول دستہ بننا ہے۔ نظامِ تعلیم کو ان نظریاتی بنیادوں پر ترتیب دینے کے لیے حکومت انقلابی اقدامات کرے۔ اس ایٹمی دَور میں منازل کو بسرعت تمام طے کرنے کے لیے قومی زبانوں کو ہی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنائے اور غیر ملکی نظریاتی اور تہذیبی یلغار کو روکنے کے لیے مثبت تدابیر بروئے کار لائے تاکہ زندگی کے حقائق کا صحیح شعور حاصل کر کے طالب علموں اور نوجوانوں کا زجاجِ حریفِ سنگ ہو سکے۔

تلافیِ مافات: مان لینا چاہیے کہ ثباتِ صرف تغیر کو ہے اس لیے ہمیں عوام کی رائے کے احترام میں اپنے فکر و عمل میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے کہ یہی حقیقت پسندی اور وطن دوستی کا تقاضا ہے اور وسیع مشربی اور بالغ نظری سے کام لے کر عوامی خواہشات و جذبات کی ترجمان تمام ان سیاسی جماعتوں اور قائدین سے مرکز کی صحیح مضبوطی کے لیے مشترکہ سیاسی محاذ بنانا چاہیے جن کا نصب العین سامراجی اثرات، اجارہ دار سرمایہ داری اور جاگیرداری زرعی نظام کو ختم کرنا اور عوامی جمہوریت کا قیام ہے۔ اس لیے تلافیِ مافات کے لیے تمام سیاسی نظربندوں اور اسیروں کو فوری طور پر رہا کیا جائے اور تمام غیر جمہوری قوانین کو منسوخ کیا جائے۔

غرضیکہ یہ اجلاس قرار دیتا ہے کہ چونکہ موجودہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل جس موجودہ معاشی اور سیاسی نظام کی پیداوار ہیں عوام شعوری طور پر اس سے لاتعلقی بلکہ بےزاری کا اظہار کر چکے ہیں جس سے مرکز کی مضبوطی کا مقصدِ رفیع ناممکن الحصول ہو گیا ہے اس لیے پاکستان کے بنیادی نظریے کی بازیابی کے لیے انقلابی قدم اُٹھایا جائے۔ حریت، اخوت اور مساوات کی اسلامی قدروں کو تعمیرِ نو کی بنیاد بنایا جائے۔ عوام کو ہر دباؤ اور جبر سے آزاد کر کے ان کی حکمرانی کا حق لوٹایا جائے اور اقتصادی جمہوریت کے قیام سے استحکامِ وطن، عوامی اتحاد اور سچی قومی خودکفالتی اور آزادی کی راہیں ہموار کی جائیں۔ متبادل پروگرام کے یہ وہ بنیادی نکات ہیں جن کی بنا پر حزبِ اختلاف کی ہم خیال اور ہم عقیدہ جماعتوں سے اتحاد کی گفت و شنید ہو سکتی ہے اور باشعور اور وطن دوست عوام کے تعاون سے رجعت پرست، استحصال پسند اور سامراج دوست عناصر کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے اور ایک مستقل اور پائیدار اسلام پرست، جمہوریت نواز اور معاشی عدل و مساوات کے حامل اور علمبردار نظامِ سیاست کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے اور سامراجیوں اور ان کے آلۂ کار استحصالی طبقوں کے ہاتھوں مظلوم انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پاکستان کو مینارۂ نور بنایا جا سکتا ہے۔

اِسلام پاکستان میں

پروفیسر محمّد عُثمان

کے بیس مضامین کا یہ مجموعہ اسلام اور پاکستان
کے بنیادی مسائل پر بڑی فکر انگیز تصنیف ہے

★

اس کے پہلے حصے میں دین اور سیاست، پردہ، جہاد، معاشی انصاف اور تعلیم جیسے اہم موضوعات پر قرآنِ حکیم کی تعلیمات کو بڑی دیانت اور صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں مصنف کا استدلال نہایت عام فہم اور اسلوب بڑا دل نشیں ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ نظامِ تعلیم، اسلامی سوشلزم اور پاکستان میں اسلام کا مستقبل کے بارے میں مصنف کے خیالات پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین پروفیسر محمد عثمان کی گہری سوچ اور ان کی اسلامی بصیرت اور دلسوزی کا پتا دیتے ہیں اور ہر اُس فرد کی توجہ کے مستحق ہیں جسے اسلام کے حال اور مستقبل میں دلچسپی ہے۔

تیسرے حصے میں سر سید احمد خان، علامہ اقبالؒ، سر آغا خان مرحوم، سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد پرویز، اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے کارناموں پر بحث ہے۔ یہاں ایک طرف تو سر سیّد کی سیاسی بصیرت اور علامہ اقبالؒ کے تعمیری موقف کا حال کھلتا اور ہمارے دلوں کو متاثر کرتا ہے تو دوسری طرف سر آغا خان جیسے بھولے بسرے رہنما کے مذہبی افکار کی ایک دلکش تصویر سامنے آتی ہے اور تیسری طرف آج کے پاکستان میں کارفرما مذہبی رجحانات کا بے لاگ جائزہ اور ان کو فروغ دینے والی شخصیتوں پر بے لاگ تبصرہ ملتا ہے۔ یہاں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم، غلام احمد پرویز، اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق پہلو بہ پہلو بیٹھے ہیں اور ان کے چہروں پر کوئی نقاب نہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں قیامِ پاکستان کے حوالے سے دو قومی نظریے اور ملک میں معاشی انصاف برپا کرنے کے امکان سے بحث ہے اور پھر ان خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر ہماری آئندہ کی تعمیری، اصلاحی اور انقلابی سرگرمیوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ کتاب وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرتی ہے۔

مکتبۂ جدید - ۴ - شارع فاطمہ جناح - لاہور
فون: ۶۳۵۴۰

ہفت روزہ نصرت لاہور —— رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۴۸۷

صدر دفتر: چوک انارکلی، لاہور۔ فون: ۶۶۶۰۶

محمد حنیف رامے نے شیخ حامد محمود کے زیر اہتمام نوائے وقت پرنٹرز لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

پاکستان
پرنس روڈ
کراچی

میں بھارت کو خبردار کرتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر اور کشمیریوں پر ظلم کرلے لیکن جونہی پاکستان میں عوامی حکومت قائم ہوگی بھارت کو پتا چل جائے گا کہ اُسے کشمیریوں سے ناانصافی کے کیا نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ کشمیر پر بھارت کا قبضہ برداشت کیا جا سکتا ہے نہ برقرار رہ سکتا ہے۔" ذوالفقار علی بھٹو